

تصوف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ تاریخ

اُردو ترجمہ

ہمعات

مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

پروفیسر محمد سرور

سندھ ساگر اکادمی - لاہور

قیمت جنوری ۱۹۵۵ء دو روپے بارہ آنے

مرکبائی پریس لاہور میں باجمام محمد مصدیقی پر نثر کا پندرہ جلدوں کا مجموعہ
۱۵ جلدیں دو ڈکلاہور کو شائع ہوئی

حضرت امام ولی اللہ نے سلوک پر چند کتابیں لکھی ہیں چنانچہ وہ ذکر اور ادب جو ایک سالک کو سب سے پہلے کرنے چاہئیں انھوں نے کھل کر ذکر فرماتے ہیں ایک ترقی یافتہ داع کو سلوک کا مقصد یہی نوع انسانی کے موطنِ خطرۃ اللہ سے احوال بچانے کے لئے آپ نے تسلیات تحریر فرمائی ہیں۔ انہوں نے اندرونی نفسی قوتوں یعنی عقل، ارادہ اور تدبیریں پر سلوک کا کیا اثر پرستی اور ایک قوت دوسری قوت کی طرح چھوٹ کر نکلتی ہے اس کا بیان آپ نے لطائف اللہیہ میں کیا ہے اور سلوک کے جوڑے سالک گزرے ہیں ان میں کوا ابتدائی دور میں حضرت غنیہ نجدی اور یزید بسطامی اور محمد اشرف تھانی ہیں اور آخری دور میں حضرت شیخ عبدالحق دیرہانی حضرت عین الدین چشتی اور حضرت بہار الدین نقشبند رحیم اللہ تعالیٰ بہت بڑے بزرگ ہیں انہوں نے سلوک کو کس طرح قریب کیا اور ان کی صحبت جو کاش کس طرح پیدا ہوئے ہے یہ ایک نعمت کا ایک منتقل باب ہے جسے امام الازہر حضرت امام ولی اللہ نے زیر نظر رسالہ معانی میں ضبط فرمایا ہے جسے تصوف کا فلسفہ تاریخی سمجھنا چاہیے۔

آج کے انسانیت میں فکر کو عقلی درجے پر کھینچ کر ایک پہلے فرائی اور دہنی حکم انسانی کے متعلق کیا خیالات رکھتے ہیں وہ اپنے خیالات کو انہیں کے عام معارف کے ساتھ کس حد تک موافق بنا سکے اور کس حکم ان کو تسلیم کر کے اپنے سلوک کو کس طرح معقول طور پر پیش کرنا ہے اس کے لئے آپ نے تسلیمات لکھی تاکہ وہ سولہ اصولِ ثبوت نے ان رسالوں کی تہذیباً اوصاف کے نام سے لکھی ہیں۔ اگر ان پانچوں رسالوں کو بخوبی ہی محنت کے غور سے چھو دیا جائے تو امام ولی اللہ کا لکھا یا ہو مگر یہ نہ کہ انھیں طرح و رسم نہیں ہو گیا ہے بلکہ اس کی تعلیم میں یہ رسالے ابتدائی قاعدوں کے طور پر چننا۔ جلتے ہیں اس کے بعد امام ولی اللہ کی حکمت کی تعلیم شروع کی باقی ہے۔

عبید اللہ بسندھی

۱۰ اپریل ۱۳۸۵ ہجری

دریہ کا سہم العلوم - لاہور

عرضِ مستر

”تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ“ مایکس حضرت شاہ ولی اللہ کے فارسی رسالے ”معائنۃ الکاظمین“ اور ترجمہ ”معائنۃ اللمعات“ کے معنی ”فطرات“ کے ہیں اور شاہ صاحب نے یہ نام اس بنا پر رکھا ہے کہ قبولِ اُن کے یہ رسالہ عبارت پر اُن چند کلمات کی جو در قبیلِ رَحْمَاتِ الہام آچکے دل پر زلزل ہوئے تاکہ یہ کلمات راعِ ملوک میں خود شاہ صاحب کے لئے اور نیز آچکے ماسخین کے لئے دستِ ہوں۔ اور طبعِ مصطفویہ کو بھی اُن سے نفعِ عام پہنچے۔

(تصوف نہیں انسانی سے بحث کرتا ہے۔ اور نہیں انسانی کے تعلق تو آپٹتے ہیں کہ اس کی گہرائیوں اور دستوں کی کوئی قیادہ نہیں۔ ظاہر ہے وہ علم جو اس کو ہر موضوعِ بندے کا، اور لازمی طور پر دقیق بھی ہوگا اور بے پایاں بھی چنانچہ اسلام میں تصوف کی ایک طویل تاریخ ہے اور مملکتِ اہل فکر کا ایک بہت بزرگ و صدیوں کی تصوف کے مسائل پر غور و خوض کرتا پایا آ رہا ہے اور نہیں انسانی کی ماہیت، اس کے نزدیک مصلوح اور اس کے نصب العین کی تحقیق و بحث میں انہوں نے اپنی عمریں صرف کر دی ہیں۔) معائنۃ میں شاہ صاحب نے تصوف کے اپنی حقائق کو بھلا بیان کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

اس کی نظر نہیں ہو سکتا کہ شاہ صاحب کے فی طلب جو لوگ تھے، وہ بحث کہیں یا وہ تصوف کی اذان تھے، اور ان کے لیے تصوف کی اصطلاحیں کو کھنڈا زائید شکل نہ تھا، اور ہمیں اس زمانے میں لوگوں میں عام طور پر تصوف کا مذاق بھی تھا چنانچہ زیرِ نظر کتاب میں جو بات شاہ صاحب شاہ میں کہ گئے ہیں، اُن میں بھی

آئی ہمارے لئے اس کا بھیجا نہایت مشکل ہو، لیکن اس زمانے میں شاہ صاحب کے مخاطب اس کو تیار نہ سمجھ سکتے ہیں، اور اس لئے تصانیف کا متن مختصر اور سبب موزوں کے لئے خاص وقت کا ہونا نہ ہو، پرتاج تو حالت ہی دوسری ہے اور زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

اس خیال کے پیش نظر ترجمہ نے اس سلسلہ میں بعض غلطی ترجیح کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ اس کی کوشش وہی کر جہاں تک ہو سکے ترجمہ میں کتاب کی اصل عبارت کو زندہ و خشک کوئی چیز نہ آئے، لیکن ترجمہ کیا ہو کہ تصنیف کا ایک اور دو جاننے والا طالب علم کتاب کے مضبوط کو سمجھ سکے، معلوم نہیں مترجم کو اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہو، اس کا صحیح اندازہ تو قارئین کو امی کر سکتے ہیں۔

”تصانیف کا فارسی نسخہ میں موجود ترجمہ کیا گیا ہو، کوئی ایک ہیں ہوا، اور بڑے چھپا تھا۔ مولانا غلامی چھپی نے جن کو دیا تو یہ کہ شاہ صاحب کی کتابوں پر عشق ہو، اس غار کسی نسخہ کی تھی تو جو صحیح زمانہ ہو، اس کے علاوہ خوش قسمتی سے مجھے اس زمانے میں تصانیف کے دو اردو ترجمے بھی مل گئے، ان میں ایک ترجمہ توماس و محترم مولوی فیض میراں کا اور دوسرا مولوی عبد اللہ شاہ فاضل کا، ایک بعض مشقی مقامات کو اصل نسخے میں مجھے ان ترجموں سے بری مدد ملی ہو، اس سلسلہ میں اس محترم زبانوں کا دل سے شکر گزار ہوں۔“

ترجمہ نے شاہ صاحب کے اس زمانے کو دوسری پیش کرنے کی ضرورت کیوں بھی؟ اور آج اس زمانے میں جب کہ ہماری قلمی زندگی کی پرانی علامت قریب قریب متزلزل ہو چکی ہے اور بظاہر اس کے گرنے میں اب کوئی روک نظر نہیں آتی، شاہ صاحب کی ”ملکت“ کو اردو دانوں کے لئے قابلِ فہم بنانے کی یہ کوشش کیوں کی گئی؟ اس بارے میں آئندہ صفحات میں کچھ عرض کیا جائے گا۔

فہرست مضامین

پیش لفظ

مقدمہ

فائزہ الکتاب

دین اسلام کی دو حیثیتیں۔ ظاہری و باطنی

تصوف کے چار دور

سلوک کی پہلی منزل۔ طاعت

ذکر و اذکار اور اوراد و وظائف

آداب سلوک

آداب ذکر

مراقبہ اور اس کے احکام

راہ سلوک کی رکاوٹیں

توحید۔ افعالی، صفاتی، ذاتی

نسبت تکینہ

نسبت ادویہ

۹

۲۱

۳۳

۳۶

۴۵

۵۲

۵۷

۶۳

۶۷

۷۳

۷۹

۸۶

۱۰۲

۱۱۸

| | |
|-----|---|
| ۱۳۲ | نسبت یادداشت |
| ۱۳۱ | نسبت تومید |
| ۱۶۲ | نسبت محقق |
| ۱۶۷ | نسبت وجد |
| ۱۷۲ | صوفیائے کرام کے طبقات اور ان کی نسبتیں |
| ۱۸۴ | انسانیت کے پیار بنیادی اخلاق |
| ۱۹۷ | نہی نوع انسان کی اصناف اور ان کی استعدادیں۔ |
| ۲۱۹ | نہی نوع انسان کے لطائف |
| ۲۳۰ | اصحاب الہدین |
| ۲۴۲ | کرامات و خواص |
| ۲۵۹ | بخت |

پیش لفظ

حضرت شاہ ولی اللہ نے جب اپنی تجدیدی دعوت کا آغاز کیا ہو تو اس وقت مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ ان کی پرانے نام بھی نکلنے پر خیال بھی بڑی ایک حکومت قائم تھی، ملک کو ہر حصے میں کافی تعداد میں ان کے جگہ خیز اور مسلح طبقے موجود تھے، افراد اور جماعتوں پر علماء کا اقتدار تھا، انھوں نے کرام کے اپنے طبقے تھے، اور عوام و خواہیں سب ان کو ماننے اور ان سے دلی عقیدت رکھتے تھے، ان کی وہ نگاہوں اور ملی مرکزوں میں فلسفہ و حکمت کا چرچا تھا، شاہ صاحب نے اپنی تجدیدی دعوت میں نئی زندگی کے اسی تمام شعبوں کو پیش نظر رکھا، اور دراصل ان کی عظمت کا راز بھی یہی ہے کہ انہوں نے عام علمین کی طرح زندگی کو کسی ایک شعبہ میں محدود نہ سمجھا، اگر وہ سدھر جائے تو ان کے خیال میں ساری کی ساری زندگی سدھر جاتی، شاہ صاحب نے زندگی کی دست پذیری اور مہم گیری کو اپنی تجدیدی دعوت پر نظر آ کر بل نہیں ہونے دیا، اور جن سرگرمیوں سے قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی سوسیں بچھڑی ہیں، ان سب پر شاہ صاحب کی نظر رہی، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی دعوت تجدید میں اتنی جامعیت ہے، اور اسی بنا پر وہ قوم کی مامنی کے مطابق اور اس کے حال کے مشاہدے کے بعد افراط و تفریط سے بچ کر پوری نئی زندگی کے احیاء کے لئے اٹھ کر دھل مرتب فرما سکے۔

واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کی اس دعوت سے بہتر اس زمانے میں اور ان حالات

میں مسلمانوں کے لئے اور کچھ سوچا نہیں جاسکتا تھا بلکہ یہی سبب نے باہر سے آکر کیا رنگ
ملک کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب نہ کروایا ہوتا تو یقیناً شاہ صاحب کی تجدید کے اثرات
بہت زیادہ دور رس ہوتے۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ ہماری قومی جمعیت کا شیرازہ بکھر
گیا۔ زمانہ بدلا۔ اور زمانے کے ساتھ حالات بھی بدلے۔ اور ان کی وجہ سے پرانی زندگی کی چالیں
بتدریج ڈھیلی ہوتی چلی گئیں۔ علماء کا افتاد کم ہو گیا۔ صوفیاء کا وہ اثر و نفوذ نہ رہا۔ قدمِ حرکت و
فلسفے کا رنگ بھیر کا پڑ گیا۔ لیکن ان تمام خرابیوں کے باوجود جو چہرئی کھر کے طلوع کئے گئے
”خونِ صہبہ زورِ انجم کی طرح ضروری ہوتی ہے۔ شاہ صاحب کی تجدید ہی دعوتِ فی زندگی
کے بعض شعبوں میں برابر اثر فرما رہی ہے۔“

شاہ صاحب نے برابر فقہ کو تقلید میں جو نلو تھا۔ اس کو توڑنے کی کوشش کی۔ باؤ
فقہی جمود کو اجتہاد سے ہر ناپا چاہا۔ اس کیلئے آپ نے حدیث کے مطالعہ اور اس کی تحقیق پر
بڑا زور دیا۔ دارالعلوم دیوبند نے اور سب چیزوں سے زیادہ خاص طور پر شاہ صاحب کی
اس دعوت کو اپنایا۔ اور فقہ حنفی کے ساتھ ساتھ حدیث کی ترویج و اشاعت کر کے فقہ و حدیث
میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بدعات اور اخراجات کے خلاف شاہ صاحب نے جو جہاد
شروع کیا تھا اور ان کے بعد حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید نے اس پر اپنا پورا
زور لگا دیا تھا۔ انھوں نے دیوبند بھی اس پر پورا بحال رکھے ہیں۔ لیکن اس کام کو اہل حدیث جماعت نے
مجاہدانہ طور پر کیا اور آپ تک نہ ہی ہو اور تو اور شاہ صاحب اور ان کی جماعت کے لڑائی نظر
مبندوستان میں ایک خاص اسلامی حکومت قائم کرنے کا جو خیال تھا۔ باوجود پنے درپے
”اکامیوں کے ہماری بعض جماعتیں اب تک اس نصب العین کی خاطر سرگرم عمل ہیں۔“

یہ تو سب کچھ ہوا لیکن شاہ صاحب نے تصوف و سلوک اور فلسفہ و حکمت کے سلسلے میں
جو تجدید فرمائی، انکی قیمت اور افادیت کو مبرا کرکھنا چاہیے تھا بعد واہوں نے کم ہی سمجھ بیدار
شاہ صاحب کے فوراً بعد ان کے خاندانی کے بعض اہل علم بزرگوں نے ضرور ادھر تو جھٹکائی

اس ضمن میں ہندوؤں نے کتابیں بھی لکھیں۔ لیکن بعد میں عام طور پر اس سے بے توجہی برقی جانے لگی اور اب جوں جوں زمانہ گزرتا جا رہا ہے، اہل علم شاہ صاحب کی حکمت اور سلوک کو زیادہ دور بوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ صورت یہ ہو گئی ہے کہ مولانا مودودی ایسے صاحب نظر عالم شاہ صاحب کے تصوف و سلوک کو ان کی تجدیدی دعوت کا ایک سقم بتاتے ہیں اور مولانا مسعود عالم ندوی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

”ہم عقیدہ وحدت الوجود کو شاہ صاحب کی ذاتیات میں تو شمار کر سکتے ہیں مگر اسے مسلک ولی الہی کی خصوصیات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اور تو اور خود شاہ صاحب کے نامور پوتے مولانا شہید وجودیت کے قائل نہ رہ سکے۔ حقیقت یہ کہ تو وہ اپنے دادا کے ہمیشہ قدم پر معلوم ہوتے ہیں لیکن بعد میں گمراہی کے سید زادے کے فیض صحبت سے غسٹہ و قسٹہ کا یہ غیر مطبوع رنگ چھپکا پڑ گیا۔“

”حقیقت میں شاہ اسماعیل ثانی نے شاہ صاحب کی حکمت اور ان کی معرفت کی تشریح فرمائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ وجہ تعلق اور اس سے کائنات کے ظہور کے تعلق شاہ صاحب کا جو نظریہ ہے، وہ صحیح ہے۔ الغرض مولانا مسعود عالم کا کہنا یہ ہو کہ اور تو اور خود حقیقت کے مصنف تک شاہ صاحب کی حکمت و معرفت کے اس اساسی اصول کے بعد میں ہم تو رہیں رہ سکے۔

ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ مولانا موصوف کا یہ ہستناں کہاں تک صحیح ہے اس وقت تو ہم صرف یہ عرض کر رہے ہیں کہ علوم و فہم میں شاہ صاحب کی تجدیدی دعوت تو بے شک ایک حد تک ضرور بار آور ہوئی۔ لیکن جہاں تک عقلی اور وجدانی علوم میں شاہ صاحب کی تجدید کا تعلق ہے اس دائرہ میں خاص طور پر جا رہے اہل علم اس سے بے توجہی برت رہے ہیں اور گو وہ کھلے ہندوں اس کا انکار نہیں فرماتے۔ لیکن حقیقت یہ کہ ان پر شاہ صاحب کی عقلیت اور وجدانیت بڑی گراں گزرتی ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

اور اس کی کیا عزت و شرف ہوگا اور آٹھ پل کر اس سے کیا نالچ نکلیں گے۔

بدعات کی مخالفت، خدا کی اصلاح اور شاعت حدیث کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا کون سا علم رکھ کر سکتا ہے۔ بیشک انفرادی اخلاق و اعمال کی درستگی اور جہنمی زندگی کے ہونا کام کے لئے ان چیزوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور ظاہر ہے انفرادی اخلاق و اعمال اور جہنمی زندگی کے بغیر کسی اصلاح زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور پھر اس سے بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جس وقت خدا و صاحب نے اپنا عجب دیدی کا م شروع کیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی جمیعت ذوال پذیرگی افراد کے اخلاق بگڑے تھے اور جہنمی زندگی میں انتشار برپا تھا، شاہ صاحب چاہتے تھے کہ کتاب و سنت نے فرد اور جماعت کی زندگی کے جو ضابطے مقرر کئے ہیں مسلمان ان کے پابند ہوں اور اس طرح خدا کرے، وہ اپنے زوال کی برستی ہوئی زندگی کو تمام میں اپنی رائے میں اور ان اعمال میں زندگی کے ان ضابطوں پر زور دینا بہت مناسب اور صحیح تھا لیکن شاہ صاحب کی دعوت کی تجدیدی جماعت نے صرف اس پر اکتفا نہ کیا تھا، انہوں نے کتاب و سنت کے ساتھ ساتھ اپنی تجدیدی دعوت میں حکمت و فلسفہ اور تصوف و سلوک کو بھی لیا تھا اور خدا تعالیٰ کی حکمت و فلسفہ اور تصوف و سلوک جہاں تک کمالی اصل حقیقت کا تعلق ہے، کتاب و سنت کے خلاف نہیں، بیشک ایمان اور عمل زندگی کی سب سے بڑی چیز ہے لیکن کیا عقل جو انسان کو دی گئی ہے خدا کی دی نہیں، اور کیا وجدان اسی کا عطیہ نہیں ہے اور کیا قرآن نے عالم آفاق اور عالم نفس میں غور و تدبر کرنا کا حکم نہیں دیا اور پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ صحیح اور اصلاح زندگی عبارت ہوئی ہے ایمان و عمل یعنی مادہ عقل اور وجدان دونوں میں ہم آہنگی اور تناسب کا۔

جس سے اس کسی خاص فلسفہ یا مخصوص تصوف کی بحث نہیں، اس وقت تو ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ شاہ صاحب کی تجدیدی دعوت جس کتاب و سنت کے متعلق جو مروجہ علوم تھے ان تک محدود نہ تھی بلکہ عالم آفاق کو سمجھنے اور سمجھائے جس میں جو علوم حکمت و فلسفہ کے ذیل میں اور عالم نفس کی معرفت و تحقیق کے سلسلہ میں جو معارف تصوف و سلوک کے ذیل میں

اس زمانہ میں مدون ہو چکے تھے۔ ان کو پڑھنے پڑھانے اور ان کی تنقید و تصحیح کرنے کے بھی شاہ صاحب نے دعوت دی تھی۔ اور اس کو ان کا مقصد یہ تھا کہ کتاب و سنت کے ارشادات کے مطابق جو اس میں شک نہیں ہو اور وہی اور ملی زندگی کے نئے مسائل و فکر کی حیثیت رکھتے ہیں یہاں اپنی عقلی اور وجدانی زندگی کی بھی تعمیر کریں اور اس طرح یہاں باطن اور عمل صالح کے ساتھ ساتھ آفاق و انفس کی تحقیق ملی اور تعمیر عملی میں بھی ہم برابر آگے بڑھیں۔ اس کو فکاہ نہیں ہو سکا مگر شاہ صاحب کے زمانے میں عقلی علوم اور وجدانی حارف کا جو ذخیرہ جمع ہو گیا تھا اس میں بہت بڑا دلب و دایس موجود تھا۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ شاہ صاحب نے جہاں تک کہ ان کے زمانے میں اور ان حالات میں ممکن تھا اس طیارہ کو چھانٹنے چھکنے کی کوشش کی۔ اور اس میں وہ ایک سنگ کا سیلاب بھی ہو چکا لیکن ان کے بعد کیا اس کی ضرورت نہ تھی کہ چھانٹنے اور چھکنے کا یہ عمل ہم برہنہ جاری رکھتے اور دیکھتے جیسے زمانہ دمگے بڑھا، اور تحقیق و انکشاف کے نئے نئے ذرائع تک پہنچی رہتے ہوئے ہم ان علوم و معارف میں اصلاح کرتے جاتے اور اس طرح ہم آج زندہ اور زندگی بخش افکار کے مالک ہوتے اور ہماری قومی زندگی پر یہ بود جو اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں یوں طاری نہ ہوتا۔ لیکن ہو گیا، اس کی تحصیل اور پڑھائی بھی ہے اور اس سے کیا نرات مرتب ہوئے وہ بھی سنئے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ، کچھ عرصہ بہت محکمت کے قیام کی راہ چلے گئے ہوئے فرمائے ہیں: "ہمارے فکر و گزری نے جو تہذیب پیدا کیا تھا جو ہمارے قائم کئے تھے، وہ اسی جو رے عالم میں ہیں حکومت و معیشت کا قانون، علوم و فنون جو ہم نے پیدا کئے تھے، وہ جو اب زائل ہوئے اور افکار بنیادی کی مرکزی حرارت سرد پڑ جانے سے سب کے سب ٹکٹے ٹکڑے ہو رہے ہیں، اور ایسا یوں ہوا ہے کہ ذاکر صاحب کے قومی زندگی کا مرکز اس کے بنیادی افکار ہوتے ہیں، اس کے عقیدے، اس کا تقاضا، ہمارا، اس کے سید کردار اس کی معیاری زندگی کے نمونے اور اس کی اجتماعی زندگی کے دیوے، ان کے لئے قوم

کی انفرادی اور اجتماعی جدوجہد وقت چرتی ہے تو قومی زندگی کا نشوونما ہوتا رہتا ہے جب اس مرکز پر زندہ اور زندگی بخش افکار اپنی نہیں رہتے، محض عاداتیں اور لفظ میں جاتے ہیں تو حیات قومی پر مجبور و طاری ہو جاتی ہے لیکن یہ زندہ اور زندگی بخش افکار سے ہم کیوں محروم ہوئے؟ اس لئے کہ ہم نے اپنی قوم کے عقلی اور وجدانی سربراہی علم سے قطع تعلق کر لیا اگر ہم اپنے عقلی اور وجدانی علوم سے واقف ہوتے تو لا محالہ نئے حقائق، زندگی کی کریم بھی ہم کر سکتے اور اپنی علمی و فکری کتابوں کو بھی جہاں چیتے اور اس طرح مجبور و ہمیں لاشعریہ جان نہ بنا دیتا۔ غرضیکہ ہمارے نزدیک شاہ صاحب کی دعوت تجویز کس کتاب و مکتب کے علوم تک محدود نہ تھی، بلکہ اس دعوت میں یہ بھی شامل تھا کہ سلب و الہی پر چلنے والے حکمت و فلسفہ اور تصوف و سلوک کے علوم و معارف میں بھی اپنی بہت و تحقیق کا سلسلہ جاری رکھتے تاکہ اس طرح ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ساتھ قوم کی عقلی اور باطنی زندگی میں بھی حرکت رہتی دوسرے نظموں میں شاہ صاحب کی دعوت تجدید زندگی کے دو پہلوؤں پر جامع عقلی و فرائض کی اخلاقی پختگی اور جماعتی تنظیم کے پہلو پر بھی جتنی آپ رجوع الی اسلف الصالح "کہہ چکے اور دوسرے کے نئے سے نئی فکری و علمی دنیاؤں کے انکشاف کے پہلو پر بھی لیکن آخر یہ کیا تھا ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان کی دعوت کے پہلے پہلو کے مقابلہ میں دوسرا پہلو نہ بچا کمزور ہوتا گیا، یہاں تک کہ آج اسی کے عقیدت مندوں کی ایک جماعت شاہ صاحب کی دعوت کے اس پہلو کا سرے سے انکار کر رہی ہے۔

شاہ صاحب کی دعوت کے اس نشیب و فراز کو سمجھنے کے لئے مسلمانوں کی گزشتہ سو سال کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیے، اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں مسلمانوں کی قومی حیثیت کو زوال کے انجام بد سے بچانے کے لئے ولی الہی تحریک برسرِ کار آئی ہے۔ یہ تحریک اپنے سیاسی مقصد میں ناکام ہوئی تو اس کا نتیجہ تھا کہ قومی حیثیت کا جو سیاسی محور تھا، وہ نہ رہا چنانچہ ہم پوری طرح زوال کے تیرے میں آ گئے، جب زوال کا پہاڑ زوروں پر چڑھتا ہے

وقت بختیت مجموعی قوم کو اچھے حکم بردھانے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ اپنے وجود کو زوال کی رو میں پہنچانے سے بچانے کے لئے اپنے پاؤں پہنچے رہنے کی، ایسے موقع پر قوم کے بھی خواہوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ افراد کو ادھر ادھر مت بکھریں، ایک وحدت قومی میں بٹکنے کی کوشش کریں، اور اس میں اگر انہیں ایک حد تک وحدت پسندی کا بھی طعن متناہزے تو وہ اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ کیونکہ وہ وحدت جو زوال میں قوم کے خیر و نہ کو منتشر کرنے کا باعث اس سے وہ وحدت پسندی بدرجہا بہتر ہے، جس سے کم از کم قوم کی وحدت تو برقرار رہے، یک سلسلہ میں مقلد اقبال، سرخودوی میں ایک خلیفہ فراتے ہیں کہ زوال میں جبہاد و تقلید اولیٰ ہوئی ہے کیونکہ اس تو وحدت قومی تو قائم رہتی ہے۔

بیشکے وال میں تقلید اجتہاد سے اولیٰ تر ہوتی ہے، لیکن اس تقلید کی بھی ایک حد ہوتی ہے، مگر قوم اس حد تک بڑھ جائے تو تقلید ہی کو زندگی کا اساس بنائے تو اس کا نتیجہ مورد اور قوم کی موت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ زوال میں بعض افراد ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو تقلید پر اپنی نہیں سمجھتے، اور وہ خود اپنے اجتہاد و فکر سے کام لیتے ہیں، اور اس میں وہ کسی کی مخالفت یا ناخوشی کی پروا نہیں کرتے، چنانچہ وہ خود اپنے پاؤں پر نئی زندگی کی راہوں پر چل کھڑے ہوتے ہیں، اور دوسروں کو بھی اپنے جیسے آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ جمہور ان کی مخالفت کرتے ہیں، اور عام طور پر ان کی اس جرات کو سبک سری سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اکثر دیا جاتا بھی ہے کہ انہوں کی مخالفت، اور اس کی وجہ سے اپنے اور ضرورت سے زیادہ احمق ہو کر ایک حد تک خندہ و پھر زندگی تھی، اور ان کی نئی راہی، اور ان پر نئی زندگی کے پروردہ، الغرض ان اسباب کی وجہ سے ان جرات آؤں سے بڑی مغزشیں ہوتی ہیں لیکن ان کے بعد جب دوسرا دور آتا ہے تو زمانہ بہت کچھ بدل چکا ہوتا ہے، اس وقت تقلید ہی والوں کو بھی اپنی تقلید پر اتنا اصرار نہیں ہوتا، اور نہ اس وقت تقلید کی اتنی ضرورت ہی رہتی ہے، اور اس آئنا میں اجتہاد و فکر والے بھی تقلید کے عقبت اور مقلد پہلوؤں میں آتا

ہونچکے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قدامت پسند اور جدت پسند دونوں کی ایک نئی قومی جمعیت تشکیل کرتے ہیں اور یہ جمعیت زندگی کے نئے معیار بناتی ہے اور قوم میں فکر و عمل کے نئے عرصے پیدا کرتی ہے اور اس طرح یہ قوم زوال سے عمل کرتی کی خاطر راہ پر پھرتے چل کھڑی ہوتی ہے۔

ہماری قوم کی اس بد قسمتی سمجھئے کہ قومی جمعیت کے سیاسی محور کے ٹوٹنے کے بعد ہم جدت اور قدامت کی جن دورا ہوں پر پڑ گئے تھے، تنازعہ مگر کرنے کے باوجود ہمارے ان دو گروہوں میں کوئی باقاعدہ مصالحت نہیں ہوئی اور دونوں گروہوں کی کوئی نئی جمعیت تشکیل نہیں کر سکے، بلکہ اس کے برعکس دونوں میں بھد اور جھگڑت کی یہ طبع برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ بیشک اس دوران میں دو گروہوں میں بعض خدا کے بندے ضرور ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے دونوں کو قریب لانے کی کوشش کی لیکن اس میں اکثر یہاں ہوا کہ اگر علماء کرام میں سے کوئی بزرگ نئے طبقوں کی طرف بڑھا اور اس نے نئی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی، اور اس کے مطابق اس نے، جہاں ہنگام سے کام لے کر ہی رہیں تجویز کریں تو علماء اس سے بدگم گئے اور اگر نئے طبقوں میں سے کوئی عوامی نظر رکھنے والا انہوں نے جدت پسندوں کو قومی زندگی کے تسلسل کی اہمیت سمجھائی۔ تو ان کو بھی کوئی سائنسی شے، چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم برابر زوال کے دھاک پر پہنچے بیٹے جا رہے ہیں۔ پرانی قومی اہمیت تو نئے سرے سے بننے سے رہی، وہ اگر ازلہ برابر بننے کی یہ اہمیت رکھتی تو ٹوٹی ہی کیوں، نئے لوگ نئی قومی جمعیت بنانے پر رہے کیونکہ یہ عام ملی روایات اور قومی تاریخ کے حاملوں کی عملی حرکت کے بغیر ممکن نہیں اور یہ ہمارے ان چیزوں سے بالکل باطل ماہد ہیں۔ اب صورت یہ ہے کہ پرگٹنے نئے زمانے کے نئے متنوں اور آفتوں کی تاب نہ لے کر پیچھے کی طرف کھینچے چلے جا رہے ہیں اور وہ ایسے دور کا خواب دیکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں، جہاں بن متنوں اور آفتوں کا کسی اثر نشان تک نہ تھا، اور ان کو یہ خوش فہمی ہے کہ محض خواب دیکھ لینے سے کون دھمکان

میں ایک عالم گیر اور مگر مفتاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح دنیا کئی زندہ
 لگا کر اس دور میں پہنچ سکتی ہے۔ میں کا وہ اپنے عافیت بخش اور بڑے سکون گوشوں
 میں اپنے خواب دیکھ رہے ہیں۔ دوسری طرف نئے ہیں جو برابر آگے بڑھتے جا رہے
 ہیں اور انھیں خبر نہیں کہ ان کے پیچھے بھی کوئی آ رہا ہے یا نہیں۔ یعنی جو سلف صاحب
 کی روایات کے حامل ہیں، عقائد کی زندگی سے بے تعلق ہیں اور جو آج کی زندگی کو جگانے
 میں انھیں اپنے مذہب اور اپنی قومی تاریخ سے دور کا بھی واسطہ نہیں، اور یہ ہے وہ
 کش مکش جو قدامت پسندوں کو اور قدامت پسند اور ہمدت پسندوں کو اور جدت پسند
 بنادہی جو اور اعتدالی خیالوں پیدا ہوتا ہے نہ رہاں۔

شاہ صاحب کی تجدیدی دعوت کو نئے لوگ تو سمجھنے سے رہے، ان کے دے کے ہمارے
 قوم میں صرف علانے کرام ہی تھے جو اس دعوت کو سمجھتے اور دوسروں کو سمجھاتے، لیکن وہ
 بدقسمتی سے اب تک اس خیال میں ہیں کہ تفریح و تہجد کی وجہ سے مسلمانوں کی قومی جمیعت
 میں جو رخنے پڑ رہے ہیں، آج سب سے اہم فرض صرف ان کا مذاکرہ کرنا ہے، دوسرے
 تعلقوں میں سمجھائے اس کے کہ اب وہ تفریح و تہجد کی پادشہ پرانا عرصہ گزرنے کے
 بعد زندگی کے نئے تقاضوں اور مذہبی تعلیمات اور قومی روایات میں توازن پیدا
 کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کا کام آج بھی محض قدیم کی حفاظت ہی ہے اور وہ
 اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ پرانی جمیعت قومی کو جو واقعہ ہے کہ کبھی کی
 ٹوٹ چکی ہے، برقرار رکھیں گے، الغرض یہ اسباب و حالات ہیں جن کی وجہ سے
 ہمارے علما شاہ صاحب کی دعوت ”رجوع الی سلف الصالح“ پر تو زیادہ زور
 دیتے ہیں، لیکن وہ شاہ صاحب کی عقلیت اور تصوف و سلوک سے کوئی تعلق نہیں جانتے
 ہیں، اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ خدا کتنا ستمگرہ اگر وہ اسی روش پر رہے تو اس
 کا کیا نتیجہ ہو گا۔

تصعب قویہ ہے کہ دنیا آگے بڑھ رہی ہے، لیکن ہمارے علماء میں کہ وہ اپنے
 پیشروؤں کے نقش قدم کی محی پیچھے بہت رہے ہیں۔ مثلاً دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا
 محمد قاسم ایک جید عالم دیں تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کی حکمت پر
 بھی ان کو پورا عبور تھا، چاہیے قویہ تھا، دیوبند سے مولانا محمد قاسم کے بعد ایک
 اور مولانا محمد قاسم پیدا ہونے جو نہ صرف یہ کہ حکمت دلی الہی کے عالم ہونے، بلکہ وہ
 معنوی حکمت کے ادا و معاد کو سمجھ جاتے، لیکن ہو کیا، مولانا محمد قاسم کی راہ پر چل کر
 آگے بڑھنا تو ایک طرف رہا، دیوبند نے شاہ صاحب کی حکمت سے، یکسی لینا ہی غیور
 دی، دوسری مثال مذکورہ کی ہے، مولانا شبلی نے نئے زمانے میں نئے علم کلام
 کی ضرورت سمجھ لی، اور اس سلسلے میں انہوں نے بعض قابل قدر کتابیں بھی لکھیں لیکن
 انکے بعد کیا ہوا؟ ان کے جانشین اور نام لیا آج سرے سے علم کلام کا نام سننے کو
 تیار نہیں، اور اگر اس کا بس چلے تو وہ مولانا کی نوات کو قبول کن کے، ان حضرات ہی سے
 بالا تر ثابت کریں۔ اس معاملہ میں ترقی پسند گروہ کلامی یہی مثال ہو، اور وہ بھی آقا، شاہ، احمد
 اسی دگر پر ہمارا ہے، سرسید نے خاص عقلیت کے معیاروں پر اسلام کو صحیح ثابت کرنا
 چاہا، اور غلام ہے اس معاملہ میں ان کی فاش غلطیاں ہوئیں، لیکن کیا سرسید کا یہ کام نہیں
 رک جانا چاہیے، خاص ضرورت تو اس امر کی تھی کہ ان کے ایسے جانشین ہوتے جو ان غلطیوں
 کی اصلاح کرتے، اور قدیم و جدید کو جمع، جنگ کرنے میں ان کی کوشش زیادہ مفید نہیں
 یہ نتیجہ ہے، ہمارے قدیم طبقوں کا شاہ صاحب کی حکمت و معرفت سے بے گروہی
 برتنے کا، اور یہ حلیہ ہے ہمارے جدت پسندوں کا قومی ذہن و فکر کا بلکہ رہنے کا اب
 حالت یہ ہے کہ نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنوں میں اپنے قومی وجود اور اس
 کی اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی قدروں کے بارے میں طرح طرح کے سوالات
 پیدا ہوتے ہیں، اور مجبوراً ان کو اپنے علماء دیوبند کا رخ کرنا پڑتا ہے لیکن صورت

یہ ہو گئی ہے کہ بقول ڈاکٹر خاکر میں خالی کچھ تو وہاں سوالوں کو وضاحت اور برائت کے ساتھ پیش نہیں کرتے، کچھ ان کا جواب دینے والے ان سوالوں کو ٹھیک نہیں سمجھتے۔ وہ جو اب دیتے ہیں، جو ان کے لئے قابل فہم نہیں ہوتا۔
 سچ ہے وہ ایک زبان بولتے ہیں، یہ دوسری زبان میں جواب دیتے ہیں۔
 ظاہر ہے یہ صورت حال کسی طرح بھی قابل اطمینان نہیں، اور ضرورت ہے کہ اس کا جلد سے جلد تدارک ہو۔

جے شک شاہ صاحب نے کتاب وسنت کی صحیح تعلیمات کی جو راہ دکھائی تھی، کم و بیش اس راہ کا فیض اب تک جاری ہے، لیکن علماء اور جدید طبقوں میں جو فکری تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں، اس کو دور کرنے کے لئے ہمارے خیال میں ضرورت اس امر کی ہے کہ حکمت و فلسفہ اور تصوف و سلوک میں شاہ صاحب نے علوم و معارف کا جو سرمایہ چھوڑا ہے، اور چونکہ دو سو برس سے ہم نے اس کو جوں کا توں ہی رہنے دیا ہے، اور اس طویل مدت میں علمی و فکری دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ اس لئے یقینی بات حتیٰ کہ اس سرمایہ علمی پر فرسودگی کا رنگ چڑھ جاتا، ہم اس سرمایہ کو دیکھیں، اُسے جانیں، پرکھیں، اور اُس کی اشاعت کریں۔ اس اُمید پر کہ شاید یہ چیز ذریعہ بنے اتصال فکری کا قدیم اور جدید کے درمیان، اور علماء اور سنی تعلیم یافتہ طبقوں میں۔

ہمارا خیال ہے کہ آج اس زمانہ میں مسلمانوں کے پڑانے علمی طبقوں اور نئے نسلیہ یا فتنہ طبقوں میں جو خلیج پیدا ہو گئی ہے، اس کو کم سے کم ہلکا کرنا، تو صرف اسی طرح ہی ہر جا جاسکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کی حکمت کی اشاعت ہو، اگر نئے اس کے ذریعہ قوم کی ذہنی میراث سے آگاہ ہوں، اور پڑانے اس کو واسطہ بنائیں۔ قدیم سے عہد جدید میں آنے والا اور اس

طرح جدت اور قدامت میں راۓ وسط پیدا ہوا اور ہماری قوم کے یہ دونوں
 طبقے نئی جمیت قومی کی تشکیل کریں۔ اور اس میں نئی زندگی کی روح پھونکیں۔

مقدمہ

(ابھیشیت مجموعی ایک قوم کی مذہبی زندگی کو نئے تاریخی ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مذہبی زندگی کا پہلا دور ایمان اور عمل کا ہوتا ہے۔ ابتدائی کار میں مذہب کی طرف سے چند عقائد کی دعوت دی جاتی ہے اور لوگ پورے مخصوص سائن عقائد پر ایمان لاتے ہیں۔ اور اس ضمن میں جو کچھ نہیں کہنے کو کہا جاتا ہے بڑی جوش اور دوسے کو وہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ دور میں مذہبی مسائل پر شاذ و نادر ہی بحثیں ہوتی ہیں اور لوگوں کو بھی اس امر کی بہت کم ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ مذہبی عقائد کا عقلی تجزیہ کر کے دیکھیں کہ یہ عقائد قواعد عقل پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ عقائد کی طرح مذہبی اعمال کی افادیت کو جاننے کی بھی یہاں دور میں کسی کو زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ چنانچہ عام طور پر جوتا ہے کہ پیغمبر اور اس کے شاگردوں کی ذات اور ان کی سنتوں پر پورا پورا اعتماد ہوتا ہے، اور جو کچھ وہ اس نے اور کرنے کو کہتے ہیں، لوگ ان کی ایک ایک چیز کو صحیح اور فائدہ بخش پاتے ہیں۔ آخر میں اس دور میں ایمان اور عمل کو زندگی کا اہل قصود مانا جاتا ہے، اور قوم کے غالب حصے کی تمام کام کو شخص صرف اسی مقصد کے لئے وقف ہو جاتی ہیں۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ قوم کی جامعہ زندگی میں براہ کرم اور ضبط ہوتا ہے اور ہر شخص عمل اور اقدام کا دلوں اپنے اند پاتا ہے۔ اس کے بعد جو دور آتا ہے، اس میں عقل کی طرف سے ایمان کی حقیقت اور اعمال کی نوعیت کو سمجھنے کی کوششیں شروع ہو جاتی ہیں اب لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوالات تھے

ہیں کہ آخرا بیان کیا چیز پر کیا وہ محض ایک قلبی کیفیت پر یا ایمان میں اعمال میں شامل ہیں یا اور نیز جن چیزوں پر ایمان لانے کو کہا گیا ہو، اُن کی اصل حقیقت کیا ہو؟ ذات باری تعالیٰ کی کیا نوعیت ہو؟ اس نے یہ کائنات کس طرح پیدا کی؟ اور کائنات اور ذات باری میں کیا تعلق ہو؟ الغرض یہ اور اسی قبیل کے ہزاروں اور سوالات ذہن انسانی کا کھنڈر کرتا ہے۔ یہ دور قوم کی مذہبی زندگی میں عقلی تبس اور گرد کا دور ہوتا ہے اور اس میں مذہب کے حقائق کو عقل کے زیر پر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے چنانچہ اس دور میں قوم میں فلسفہ و منطق کو فروغ ہوتا ہے۔ اُس میں مختلف فکری کتب وجود میں آتے ہیں۔ لوگ آپس میں بحث و مناظرے کرتے ہیں اور عقل اور صرف عقل کو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور دین کی کلید سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس دور میں عقل کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اس کے بعد قوم کی مذہبی زندگی کا تیسرا دور آتا ہے۔ اس دور تک پہنچتے پہنچتے قوم میں عقل کے جذبات قدرے سرد پڑ چکے ہوتے ہیں، دوسرے عقلموں میں قوم زندگی کے نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے کرتے کچھ عقلی جہتی ہو جاتا ہے اور پھر عقل کی دہائی کو بھی وہ آ رہا ہوتا ہے۔ اس دور عقل پائے زیادہ اعتدال میں رہتا عقل کو ایک طرف اس کا وہ باطنی سکون جو ایمان بالغیب کو پیدا ہوتا ہے، چھین جاتا ہے اور دوسری طرف عقل کی بے مانیوں اس کی جمیست میں ایک جہتی نہیں رہنے دیتیں۔ بات یہ کہ اس دور میں لوگ سوچتے زیادہ میں داخل کم کرتے ہیں اور عقل کی کمی اور بے سچاری کی زیادتی زندگی میں اکثر اشارہ کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ ذہنی اتحاد کا زور ہوتا ہے اور قوم کی اخلاقی زندگی تباہ ہلا ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں قوم کی مذہبی جس اگر باطنی مغز نہیں بچی ہوئی تو وہ مجبور ہو جاتی ہے کہ اپنے لئے کوئی پناہ یا مقام ڈھونڈے اور اس کے لئے اُسے لامحالہ انسانی زندگی کے باطن کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے یعنی جب خارج میں مذہب کے اعلیٰ تصورات کے لئے آج وہ ہوا باطل نامساعد کار ہوئی ہے تو انسانی جذبات کی گہرائیاں ان تصورات کو اپنے ہاں پناہ دیتی

ہیں، جہاں نہ دنیا کے مادی خرنشے، موثر ہو سکتے ہیں، اور نہ وہاں کسی ظالم و مستبد حکومت کی وار و گیر کا مظاہرہ ہوتا ہو۔ خارج سے آگنا کر اپنے باطن میں اس دیکھون ڈھونڈنا انسانی فطرت کا ایک قدرتی تقاضہ ہے۔ اور نامساعد حالات میں بھی اسکی زندگی کا سہارا اور بچاؤ بھی ہے۔ خدا بخواند اگر انسان اس وصف طبعی سے محروم ہوتا تو جب کبھی بھی باقی اس کے سر سے گزرتا، اور وہ یہ بھی جان لیتا کہ اب ان اٹھتے ہوئے طوفانوں کو روکنا کسی انسانی طاقت سے باہر ہوگا۔ اور یہ بات محض ہماری خیال آرائی نہیں، بلکہ قوموں کی زندگی میں بار بار ایسا ہو چکا ہے، تو اس صورت میں انسان کا یقین ذہن یا تو اس سے خوب کٹتی کر رہتا اور یا اسے با شعور درجہ سے بے شعور حیوانی منزل میں آہٹنے پر مجبور کرتا۔ بیشک خارج کو باطن نظر انداز کر کے صرف باطن میں بناء و حوصلہ انسان کی شکست ہے، لیکن اس کو مٹا تو جوتا ہے کہ جب انسان فحاشی میں سب کچھ کھو بیٹھا ہو تو اس کی وجہ سے کم سے کم وہ اپنے باطن میں سکون حاصل کر لیتا ہے۔

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر مذہب ہو جس کو اپنے زمانے میں کم و بیش اس قسم کے تاریخی مادہ کو نہ گزرتا ہو۔ مذہبی زندگی کے اس آخری دور میں جیسا کہ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں، قوم کی زیادہ تر قویاں اپنے باطن کی طرف مبذول ہو جاتی ہیں، تصوف اور علمو معنی مفہم میں مذہب کے اسی پہلو پر زیادہ بحث کرتا ہے۔ افغانی ہر مذہب میں کسی نہ کسی صورت میں تصوف کا یہ رجحان ہو چکا ہے اور یہی عہد از قیاس ہے۔ ہر قوم نے تصوف کے اس رجحان کو حسب استعداد ایک ملکی شکل دینے کی اپنی کوشش کی ہوئی۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی پیش نظر کتاب مہیات مسلمانوں کے وہی علم تصوف پر ایک مختصر سا تبصرہ ہے۔

یہ تو آج ہر شخص کو تسلیم ہے کہ انسان کے اندر قوتوں کا ایک لامحدود خزانہ ہے، چنانچہ جب انسان ان قوتوں کو بنیائے گرد و پیش کی تسخیر میں لگاتا ہے تو اس کے باقی سے جو چیز باقی و قوی پذیر ہوتے ہیں، اس زمانے میں عامی سے عامی آدمی بھی ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ

راہ پر لیکن جب انسان اپنی اپنی اجازت آفریں قوتوں کے مسخ کو خود اپنے باطن کی طرف موڑتا ہوگا تو ذرا اندازہ لگائیے کہ اس کی فتوحات نفس کی کن بے کنار دستوں کو اپنے دائرہ میں سمیٹ لیتی ہوں گی۔ بیچک عالم آفاق کی کوئی تہاہ نہیں لیکن جس افراد کو عالم نفس میں تحقیق کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ ان کی واردات کو پتہ چلتا ہو کہ یہ عالم بھی خارجی عالم سے اپنی وسعت اور گہرائی میں کسی طرح کم نہیں، انسانیت ہزار ہا ہزار سال سے اس عالم کے حقائق کے انکشافات کے سلسلہ میں جو کوششیں کرتی چلی آ رہی ہے، علم تصوف میں ان سے متعارف کرنا ہی

(اس میں شک نہیں کہ انسان کی لامحدود قوتیں عالم آفاق کی پیمائش صرف نفس انسانی کو اپنی حقیقی و تسخیر کا مرکز بناتی ہیں تو اسکی وجہ سے اس پر زندگی کے وہ بڑے حقائق منکشف ہوتے ہیں کہ جن کی دستوں اور گہرائیوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اگر انسان محض اپنی باطنی دنیاؤں کی دستوں اور گہرائیوں میں کھوجائے تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ خارجی دنیا کی اصل بے تعلق ہو جاتا ہے۔ باطنی زندگی ظاہری صرف تصورات اور احساسات کی زندگی ہے اور تصورات اور احساسات خواہ وہ کتنے ہی دلکش اور نشاط آد کیوں نہ ہوں صرف ان کی بنیادوں پر خارج میں کسی زندہ اور محکم بدن کی عمارت نہیں بن سکتی چنانچہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب کوئی قوم مذہبی زندگی کے اس مرحلہ پر پہنچی تو اس نے دنیا کی حرکت و عمل کو ایک فریب خیال سمجھا اور وہ اپنے باطن میں اس طرح کمن ہو گئی کہ اس کو خارجی زندگی کے تشیب و فزا کا کوئی ہوش ہی نہ رہا اور آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ خارج سے تو اس کا تعلق ٹوٹا ہی تھا۔ آگے چل کر اس کا باطن بھی کٹ سٹا کر مچا گیا۔

ہر قوم میں تصوف کا انجام اکثر یہی ہوا ہے لیکن تصوف اسلام میں پرک زیر نظر کتاب میں بحث کی گئی ہے، اس معاملہ میں اگر عامر علیا نہیں تو اصولاً تو یقیناً راۃ اعتدال

برقائے ربہ اور اس کی وجہ کچھ تو اسلام کی ذاتی خصوصیات ہیں اور دوسرے جن سلطان قوموں نے اپنے اپنے زمانے میں اس تصوف کو اپنا رنگ دیا، ان کے قومی مزاج اور پھر ان کو جن تاریخی حالات میں گزرنا پڑا، ان کی وجہ سے ہمارے علم تصوف اس ٹکری زریج اور عملی بدعاتی کے درجے تک نہ پہنچا جو باطنی زندگی میں حد سے زیادہ انہماک و خارجی زندگی کی ضرورت کی زیادہ قطع تعلق کر لینے کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔

اسلام عیسائیت کا اپنا دعویٰ ہے، دین وسط ہے۔ وہ خارجی اور باطنی زندگی میں توازن چاہتا ہے۔ فکر و عمل میں حد اوسط قائم کرتا ہے۔ ایمان اور عمل دونوں کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور خوش قسمتی سے اس نے جنم ہی ایک ایسی سرزمین میں لیا، جو مشرق اور مغرب کو لانے والی کڑی تھی، اور ایک طرف اس کا رشتہ ہندوستان اور چین کے ساتھ قائم تھا اور دوسری طرف یونان و روم و ایران و سیلی اس کے گہرے تعلقاً تھے، اور پھر جس قوم نے سب سے پہلے اس دین کو اپنایا، اور اس کے تصورات کے خاکوں میں رنگ بھرا وہ عربوں جیسی عملی قوم تھی، اور پھر ان کے بعد جس قوم نے سلاطین و فنون اور ادب و فلسفہ کو ترقی دی، وہ ایرانیوں ایسی زمین قوم تھی جس کی طبیعت کا رجحان فکر اور باطن کی طرف زیادہ تھا۔

اسلام میں تصوف کا پیدا ہونا مذہبی زندگی کا ایک فطری ارتقا تھا۔ لیکن دین اسلام کی ان خصوصیات کی بنا پر جن کا ذکر اوپر ہوا ہے تصوف اسلام کا یہ امتیاز رہا ہے کہ باوجود اس کے کہ اس کا موضوع اصلی نفس انسانی کا باطنی ریح تھا لیکن اسلامی ہونے کی وجہ سے وہ زندگی کے خارجی پہلو کو بالکل نظر انداز نہ کر سکا، اور پھر فظلوں میں گویا ایرانیوں نے اسلام کو تصوف کے رنگ میں باطنی قالب میں ضرور ڈھلا لیکن اسلامی تعلیمات کا یہ سامی اساس کہ ایمان و عمل کے بغیر باطنی زندگی بے کار ہے تصوف کی ساری تاریخ میں اصولی طور پر کہیں بھی نظروں کو اٹھل نہیں ہو سکا، چنانچہ

اسلام اقبال و مروجہ کے افکار میں اسلامی تصوف کی قوت کا راز اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ انسانی فطرت کے متعلق اس کا نقطہ نظر بہت ہی جامع و مکمل ہے اور اسی نقطہ نظر پر وہ مبنی بھی ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہ رائج العقیدہ مذہبی لوگوں کے ظلم و تعدی اور سیاسی انقلابات سے صحیح و سلامت غل آیا۔ کیونکہ یہ فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ زندگی کے متعلق انسانوں کے ہر گروہ کا رد عمل اپنے اپنے قومی مزاج اور مخصوص تاریخی حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ سامی اقوام کا اس معاملہ میں عمل کی طرف جو انسانی ارادہ کا نتیجہ ہوتا ہے، زیادہ رجحانی ہے۔ اور اس کے برعکس آریائی قومیں فکر کو زندگی کے مسئلہ کو حل کرنے کا سب سے قوی ذریعہ مانتی ہیں، چنانچہ ایک کا زور گراہی اور عمل پر ہے، تو دوسرا حکمت و فلسفہ کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ بے شک تصوف کے پیش نظر ارادہ اور عقل کی بجائے سب کے مقدم چیز جذبات انسانی ہوتے ہیں اور اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اگر جذبات انسانی میں تبدیلی پیدا کر دی جائے تو اس سے یقیناً ارادہ اور عقل میں بھی تغیر آجائیگا لیکن، اسلامی تصوف نے عربی ماحول کے ابتدائی اثرات کے تحت ارادہ کی بنیادی اہمیت کو سمجھ لیا اور نہیں کیا۔ چنانچہ ایک طرف اس نے کتاب و سنت کے انفرادی و جماعتی اعمال و واجبات کا جو ضابطہ مقرر کیا ہے، اسے اپنی تعلیمات کا اساس بنایا اور دوسری طرف عقل کو منظم کرنے کے لئے آریائی فلسفہ و حکمت کو نکلے بندوں استفادہ کیا اور باہر و طبیات کے متعلق اپنا ایک مستقل نظام فکر بنا ڈالا۔ اور اس طرح سامی اور آریائی تصورات زندگی با دوسرے نقطوں میں ایمان و عمل اور عقل و فکر کو ہم آہنگ کیا۔ اور دونوں کو ایک دوسرے

میں سمجھ کر اپنی دعوت کو ہر قوم اور ہر نسل کے لئے قابل قبول بنایا۔ چنانچہ اسلامی تصوف کی جامعیت اور ہمہ گیری کا یہی راز ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس میں علم کلام کے علم برداروں امام غزالی اور امام ولی اقتدا جیسے بزرگوں نے بھی مذہبی جستجو کا صحیح حل پایا۔ اور اس سینا اور ابن فضل جیسے فلسفیوں بھی مذہبی کے مسئلہ کو فلسفہ کے ذریعہ سمجھنے نہ دیکھ کر اس کے دائرہ میں بنناہ ڈھونڈی، اور ہر حدت آفریں شاعر نے اس کے رنگ گانے، اور ہر صاحب فکر نے اسی کو اپنا فلسفہ راہ مانا اور ہر مصنف کی ہمت اسی پر ٹوٹی۔ بالفرض ایک زمانہ آتا ہے کہ سلاطین کی تمام ذہنی زندگی کا مرکز بھی تصوف بن جاتا ہے۔ یہ آزاد خیالی کی آماجگاہ بھی ہوتا ہے اور تزکیہ اخلاق کا ذریعہ بھی اسلامی فلسفہ بھی اس کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اور تبلیغ و ارشاد اور حجرات و عمل کے لئے بھی تصوف ہمیشہ کا کام بھی دیتا ہے۔

یہ ہے اسلامی تصوف کا ایک مختصر سا تاریخی پس منظر جس کی روشنی میں ہم شاہ صاحب کی اس کتاب کو پڑھنا چاہیے۔

تصوف کے بارے میں سب سے پہلی بات جو شاہ صاحب اس کتاب میں فرماتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جہاں تک اس کی اہل روح کا تعلق ہے تصوف خود عبادت اور عبادت گزار کے نام سے میں موجود تھا، گو اس وقت نہ تو اس کا یہ نام تھا اور نہ اس کی شکل تھی جو چند صدیوں بعد مرتب ہوئی، اس سلسلہ میں شاہ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ دین اسلام کی دو کیفیتیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ اسلام کی ظاہری حیثیت کا تعلق تو ان اعمال و احکام سے ہے جن کو فرد اور جماعت کی عادی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے اور ان کی حفاظت پر انسان کے دل میں جو معنوی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، وہ مقصود اور نصب العین پر اسلام کی باطنی کیفیت کا شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دین کی ظاہری کیفیت کی حفاظت تو فقہاء محدثین مجاہدین

اور قاری کرتے رہے۔ لیکن ان کے علاوہ دین کے محافظین کا ایک دوسرا گروہ بھی رہا ہے
 طاعت و نیک شمار کی کے جن کاموں کو نفس پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور ان
 کو ان سے لذت ملتی ہو یہ بزرگ حالت الناس کو ان کاموں کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ شاہ
 صاحب کے نزدیک دین کی اس باطنی حیثیت کا مغز و درخیزہ صفت اصحابِ برہم کی
 تعریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہو کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اس شخص کے
 ساتھ تعریف کرے کہ گویا وہ کسی کو بکھر رہا ہو! اور اگر نہ ہو تو کم سے کم عبادت کرنے والے کو یہ
 یقین ہو کہ اللہ کو بکھر رہا ہو

یہ تو بھئی تصوف کی حقیقت، اس کے بعد شاہ صاحب تصوف کی تاریخی پر گفتگو فرماتے
 ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانے میں چند نسلوں
 تک جو اہل کمال بزرگ ہو کر ہیں، انکی زیادہ تر توجہ شریعت کے ظاہری اعمال کی طرف تھی، اور
 باطنی زندگی کی وہ تمام کیفیات جو تصوف کا اصل مقصود ہیں، ان لوگوں کو شرعی احکام کی
 پابندی کے ضمن میں حاصل ہو جاتی تھیں۔ ان میں کسی شخص کو اس امر کی ضرورت نہ پڑتی تھی کہ وہ
 ان معنوی کیفیات کو حاصل کرنے کے لئے بعد کے صوفیاء کی طرح سر پہنے کے بہروں وغیرہ کو کرے
 چنانچہ بزرگ خدا تعالیٰ سے قرب و حضوری کی نسبت اعمال شریعت اور ذکر و اذکار کے سوا
 کسی اور ذریعہ سے حاصل کرنے کی سعی نہ فرماتے تھے۔ الغرض یہ اسلام کے ایمان و عمل کا دور تھا۔ اور
 شاہ صاحب اسی کو تصوف کا پہلا دور قرار دیتے ہیں۔

پہلی صدی ہجری کے بعد اہل کمال کے ایک گروہ میں آپ یہ رجحان پیدا ہوا کہ وہ
 اعمال شریعت کی پوری پابندی کے ساتھ ساتھ باطنی زندگی کی نشو و نما میں لگ جاتے ہیں ان
 بزرگوں میں راہب بصری خاص طور پر ممتاز ہیں علامہ اقبال مرحوم کے الفاظ میں اس کی توجہ
 زیادہ تر باطنی تھی۔ اس مکتب کے صوفیاء کے نصب العین میں طلب علم غالب نہیں ہو، بلکہ خدا سے
 دنیا کو بے تعلقی اور خدا سے گہری محبت جو گناہ کے شعور سے پیدا ہوتی ہو انکی زندگی کے مخصوص

خط وخال میں ہو گئی، انکے تقریباً ایک سو پچاس تھوڑی بھری کے داؤل میں وائٹنری باغیچہ بھائی
 اور حیدر آبادی کا زیادہ شروع ہوا یہی حضرت حیدر کو موجودہ ظلم و ستم کا ایک کٹاواسی پانی بھٹکا ہوا ہے
 آج کل انھیں خرمی باندی کی طرف زیادہ تھکا چٹا ہے حضرت حیدر کا یہ قول شہر میں اس و عام پر کر ہوا
 علم و تصوف کتاب و سنت کے ساتھ عقیدہ آزادی و فکات ۱۹۰۹ء میں ہوئی اور انکو سیدھا بھٹکا نام
 دیا گیا شاہ ولی نے حضرت حیدر کی تصوف کا دوسرا دور شروع کرتے میں چنانچہ اس سلسلہ میں اپنے سید
 حضرت حیدر جلد وہ صوفیاء کے مشعل میں انکے زمانے میں وہاں کو کچھ بچے تصوف کے ایک اور رنگ
 کا ظہور ہوا جو اس زمانے میں یہ ہوا کہ اہل کمال میں و عام لوگ تو اس طریق پر پکا بندہ ہو چکا ذکر ہے دور کو
 شریعت میں بھیجا ہو لیکن ان میں جو خواہش تھی انہوں نے بڑی بڑی رہائشیں کیں اور دنیا کی اعلیٰ قطع
 فلاح کر لیا اور مستقل طور پر وہ ذکر و فکر میں لگ گئے اس کی ان کے اندر قوت باطن کی کثرت پیدا ہو گئی
 بنا پر یہ لوگ مدق و مرانیہ کہتے اور ان کی حوالہ تصوف میں نقل استقامت و فلاح و فلاح کی فلاح کی
 کیفیات ظاہر ہوتی ہیں لوگ سماع سنتے ہر سحر و جادو میں یہ پیش برہا تے اور پھر بے پھار تے اور دہر
 جوش میں قلم بھی کرتے گئے ۔

(حضرت حیدر کی و خصوصاً حیدر کا فتنہ مریدی بنایا ہوا جو خصوصاً خانہ قادریہ کے میں کر کے رہیں تصوف
 کیلئے ہانگ در میں گیا خصوصاً کہم و جوش ۱۹۰۳ء میں چنانچہ دی گئی اس واقعہ کے بعد ایک سو سال کو اندر
 تصوف پر جس مستقل تمام میں لگی تھیں جو میں ہوا ہر سراج کی تصنیف کتاب الفیج ابوطالب کی کی قوت
 اقبال اور قمری کا اگر سزا اور اور الفیج خرمی کی شغف محبوب خاص طور پر قابل ذکر ہیں اسی زمانے
 میں شیخ ابو سعید بن ابی الخیر اور شیخ ابو اسحاق ثقفی بھی ہوئے ہیں جن کی شاہ صاحب تصوف کے سرور دور
 کی ابتدا کرتے ہیں شیخ ابو سعید ۵۴۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۴۴ھ میں آپ کے وفات پائی ۔

تصوف کے اس دور کے مخلص شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس دور میں طریق تصوف میں ایک اور تغیر رونما ہو
 کر اہل کمال میں جو ہمہ اہم موجب سابق خرمی اور مرد و اعمال پر پھر رہا اور خواہش نے اپنی حوالہ و
 کیفیات کو اپنا نصب العین بنایا اور جو خواہش انھوں نے اہل و عوام میں پکڑ کر جذبہ
 شکر سانی حاصل کی اور اس جذبہ کی وجہ سے ان کے ساتھی قوت کی نسبت کا دروازہ کھل گیا اور مسدود

اس پر وجہ کے قیاسات کے سبب وہ ان کیلئے چاک ہو کر اور انھیں خود اپنی آنکھوں پر دیکھ لیا کہ وہ کیا
 ذات پر مشیر تمام دنیا کے وجود کا انحصار کیا تھا اور کیا وہ ایک ایسے جذبے کی وجہ سے ان بزرگوں کی
 اصلی ثابت صرف ان ہی کی کذات اسی ہیں، اپنے وجود کو قائم رکھنا، اس مقام کی کیفیات کو لذت اندوز ہونا
 چنانچہ ذات باری پر تعالیٰ کا شعور و تصوف میں اہل ایمان کی مجلسیں ہیں اور میں وحدت کا یہ تصور بھی شعور ہی کا
 مذہب و چارہ اور شاہ صاحب کے اہل ذات و بزرگ اس بحث میں نہیں پڑتے کہ کائنات کا ذات باری تعالیٰ
 سے کیا علاقہ ہے، جنہاں اس ذات میں کہے کہ ہو سکتا ہے اور خدا اور جہان کے جو عقائد ہیں ان کی اصل حقیقت کیا ہے
 - مصنف نے نہایت سلیس و سادہ الفاظ میں اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اس ذات باری تعالیٰ سے پیدا ہونے والے تصوف کی
 تاریخ میں امام غزالی کا شمار گروہ تصوف میں تو نہیں ہوتا، چنانکہ وہ عالم دین اور حکم چلنے والا اور صوفی بعد میں
 لیکن تصوف کے سلسلہ میں ان کی خدمات یہ ہیں کہ ان دنوں جو تصوف کی آواز دھیلی اور آناؤ شری کی بیڑ
 ہو رہی تو ان تصوف پر غمخیز ہو کر آواز دہتا جا رہا تھا، بے ایمانیوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا، عقل پر
 اسلام میں تحریک متحرک کے نام سے نہ بھی حقائق کی شائع میں کوئی تھی اور جو اس طرح کہ آواز دہتا جا رہا تھا
 کی شخصیت میں تصوف کے ساتھ اپنی فلسفہ تسلیم کرتی ہو اور ان میں امام غزالی کی کوششوں کا ہر تصوف
 مذہب کی سند روایات سے ملتا ہوتا ہے۔

۱۰ امام غزالی کا ۵۰۵ھ میں انتقال ہوا اور ان کے تقریباً پچاس برس بعد علم تصوف کے سبب بزرگ مصنف
 شیخ اکبر ابن عربی پیدا ہوئے تھے، صاحب کے زمانہ کو تصوف کے چوتھے دور سے تعبیر فرماتے ہیں چنانچہ اس
 دور کے مصلحت اور شاہد ہوتا ہے کہ اس دور میں ان اہل کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوئی ہے اور
 یہ لوگ کیفیات و احوال کی منزل کی گنگے کو چھو کر حقائق تصوف پر بحث کرنے لگے ہیں اور ذات واجب اور جو
 یہ کائنات کہنے لگا اور جو ان بزرگوں نے فلسفہ کائنات کے سوانح اور مشرقات کی کیفیات میں اور شاہ
 کہ وہ جب ان وجود کو سب سے پہلے کسی چیز کا حصہ رہا، پھر پھر کس طرح یہ حصہ عمل میں آیا اور اس کی طرح کے
 دوسرے مسائل ان بزرگوں کے موضوع بحث بن گئے اور پھر یہ بزرگ تصوف کے جن حقائق کو ان عربی نے
 علم و غور سے متعلق زبان میں پیش کیا تھا، ان کے بعد سنائی رحمہ اللہ اور وہی اور جہاں نے شعر کے دلکش
 اور جہاں کا آواز دہتا ہو کر یہ ہیں جن حقائق کو ان بزرگوں نے اہل علم تصوف کے سوانح و احوال سے عوام

نہم پہنچے اور ہر شخص تصوف کا علم پڑھنے لگا۔

شاہ صاحب کے نزدیک تصوف کی چار درجہیں اور اٹھ گناہ و گریہ چاروں کے چاروں طریقے مذکور ہیں۔
پہلی مقبول ہے چنانچہ اس شخص میں طبیعت فروغنے میں کہ بہت تصوف پر بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات پر خیال رکھنا چاہیے کہ اس بزرگوں کے ہر طریقے کا اقبال و حوالہ کو ان کے زمانے کے حیاؤں پر دیا گیا ہو۔

تصوف کی حقیقت اور اس کے تاریخی ارتقا پر بحث کو شیخ عبد شاہ صاحب سلوک تصوف کے مندرجہ کرتے ہیں۔
پہلی فرمائے ہیں کہ سلوک اور طریقت کا سب سے پہلا نام یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے عقائد و رستہ کو بڑے اور اسلام کے
اہتمام چاہندے ہیں۔ یہ علامت کی ضروری شاہ صاحب کے نزدیک طریقت کو پہلا مقام ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے
اور دو وظائف کو بیان کرتے ہیں۔ پہلی اپنی سالک اپنے ضروری ہے۔ پھر سلوک اور مذکور کے ادب و شرف کا بیان کیا
ہے اور مرتبہ کے جو حقیقت طریقے میں اس کا ذکر ہے۔ نیز اس راہ میں سالک کو جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ شاہ صاحب
نے ایک باب میں ان کی تفصیل کو بیان فرمایا ہے۔

براہ سلوک کا مقصد جو ہے۔ سالک چاہتا ہے کہ اس کی تصوف میں ضروری ہوتا ہے کہ ذات الہی کی شکل میں چلتا
تصوف میں توحید ذات الہی ایک بنیادی مسئلہ سمجھا جائے۔ شاہ صاحب نے اس میں بڑی عمدگی کا احوال و توحید ذات
اصحاحات اور توحید ذات پر بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں سالک توحید ذات الہی کی ترقی کے توحید صفتی میں پہنچا ہے۔ توحید
صفتی کی توحید ذاتی میں اور اس مقام میں سالک کی کو کیفیت ہوتی ہے کہ شاہ صاحب نے توحید صفتی کے مقام پر
اس کے اہم ترین ہوتا ہے۔ اس مقام پر جو کام جس نے مختلف مظاہر وجود میں لکھ فرمادے ہیں۔ اس مقام میں اہل نظر و سمی
انہماک رک نہیں سکتی بلکہ وہ اس راہ کے وسط میں جو وہ سب راہوں کا سب سے بڑا ہے۔ پہنچے والی ہے۔
بہت کم ہی مقام پر پہنچا ہے تو وہ اہل نظر صرف اصل درجہ ہی رہ جاتا ہے۔ اور یہ تمام کے تمام مظاہر و اشغال اپنے
سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ توحید ذاتی کا مقام ہے۔

راہ سلوک کو طے کرتے وقت جو کیفیت باغات سالک کے نش میں اس طرح جا کر اس میں باقی ہو کر وہ اہل
پہنچے ایک بار یہی خصوصیت ہے کہ اس کا نام تصوف کی اصطلاح میں نجات ہے اور یہ نجات کئی طرح کی ہوتی ہے
یہ شاہ صاحب نے اس میں جو ایک ایک کیفیت کو بڑی تفصیل کو بیان کیا ہے۔ یہ نجات ہے صوفیاء کو کرم کے
تکلف لطافت اور ان کی اپنی اپنی بہتوں کا حال لکھا ہے۔

تصوف میں عبادت طاعت ازکار و اخلاق اور عقول کے ذریعہ سالک کو غنی کا تزکیہ کیا جاتا ہے اور پھر بعد ازیں قابل بنایا جاتا ہے کہ قربانی اور محال کر کے ظاہر کو غنی کی فطری استعداد ایک سی نہیں ہوتی کسی میں ایک صلاحیت ہوتی ہے تو دوسری میں باطن دوسری اس کو عارف کیلئے ضروری ہے کہ وہ پہلے سالک کی طبیعت کا ذخائر نکالے اور دیکھے کہ اس کے کیا فطری رجحانات ہیں۔ اس کے بعد وہ اس کے تزکیہ غنی کیلئے مناسب راہ و سلوک تجویز کرے۔ اگر یہ نہ کیا جائے تو بالاموت قاتل سلوک کے مہلکات کا سالک پر اٹل اثر پڑے گا اور اس ضرورت کے پیش نظر شاہ صاحب نے اس کتاب میں بنی نوع انسان کی مختلف فئعوں کا ذکر کیا ہے اور ہر صنف کی فطری استعدادوں کو بیان فرمایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ کے یہ بھی بتا دیا ہے کہ کس استعداد والے کے لئے کون کون سی مشاغل مناسب ہیں کتاب کے یہ دو باب معلومات کے اعتبار سے جس کو اس زمانہ میں غیر معمولی کھیتی جا رہی ہے بڑے اہم ہیں اور عظیم قدریت ہیں گو صاحب نے ان مشاغل کو جس بڑی مدد ملی ہے۔ اس کے بعد قدرت نے انسان کے اندر جو لطافت رکھے ہیں ان کا بیان کیا اور ان لطافت کو انسان کی ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ برقی و کرمی مقام بلند پہنچے سکتا ہے اس کا ذکر ہے۔

آخر میں سالکین راہ طریقت کی مختلف فئعوں کو شاہ صاحب نے بیان فرمایا ہے اور اودیا تو کرام سے دینی و دنیاوی کمالات ظاہر ہوتی ہیں، ان پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ کمالات جو بظاہر خارق عادت نظر آتی ہیں، ان کے بھی اپنے قدرتی اسباب ہوتے ہیں۔ کتاب کا آخری باب بہت بزرگ جس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جو حوادث رونما ہوتے ہیں، ان کے بظاہر اسباب میں سے ایک سبب تجنت بھی ہے اور آخر میں حضرت شاہ صاحب نے معصات کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

”اشر فاعالی کا شکر و احسان ہے کہ تمہارا ختم ہو گئی اور اس کتاب کے شروع میں ہم نے جو شرط لکائی تھی کہ ان وجدانی علوم کے ساتھ مشغولات اور معصات کو غلط غلط نہیں جو نہ دیا جائے گا، وہ شرط پوری ہوئی؟“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ تعالیٰ ہی کے لئے سب تعریف ہے، جس نے انسانوں کے ایک گروہ کو اپنے لئے مخصوص فرمایا۔ اور اُسے دوسروں پر فضیلت بخشی۔ اور بشریت کی اپنی سے اٹھا کر اُن کو عیادت کے بند مقام پر سرفراز فرمایا اور اس طرح ان کے لئے ترقی کے سامان فراہم کئے۔ پھر اس نے اُن کی "ہویت" یعنی شخصیت کو، بیزہ ریزہ کر کے اُن پر موت مسلط کی اور ان پر موت سے نیست کیا۔ اور پھر اپنی جناب سے ان کو نئی زندگی کی صلت پہنائی۔ اور جہنم کے لئے انہیں زندہ یا وید کر دیا۔ اور بہشت میں ان کو وہ دو نعمتیں دیں، جو نہ کبھی کسی کو ملنے دیکھی، اور نہ کسی کان نے سنی تھیں اور نہ اس پر گزیدہ گروہ کے سوا کسی مومن کے دل میں ان نعمتوں کا کبھی خیال گزرا تھا۔

اس زندگی میں یہ برگزیدہ گروہ، اللہ تعالیٰ کی طرح حرج کی

نشانوں کا منظر بنا۔ اور ان کی ذاتِ گرامی سے گونا گوں کرامات کا صفہ
 ہوا۔ لیکن سب سے بڑی نعمت اور سب سے گراں قدر عزت جو ان
 نفوسِ قدسی کو عطا ہوئی، وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق
 فرمایا کہ ان کے ہاتھ میرے ہاتھ، اور ان کے پاؤں میرے پاؤں ہیں
 یہ کپڑے ہیں تو میرے ہاتھ سے کپڑے ہیں، اور چلتے ہیں تو میرے پاؤں
 سے چلتے ہیں۔

اس کے بعد میں اس امر کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور
 کوئی مہبود نہیں۔ وہ وحدہ لا شریک ہے، سب مخلوقات کا خالق
 اور سب کا مولا و آقا۔ اور میں اس امر کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ
 ہمارے سرکارِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے
 رسول ہیں، سب انبیاء و مرسلین سے اکرم و اولیٰ۔ اللہ تعالیٰ کا
 درود و سلام ہو آپ پر، آپ کی آل پر، اور آپ کے صحابہ پر
 ہر ایک کے درجہ کے مطابق اور ہر ایک کی عزت و منزلت کے
 مناسب۔ اور نیز اس کا درود و سلام ہو ان پر جنہوں نے بعد میں
 پوری فائزِ نبوت سے ان کی پیروی کی، اور وہ ان کی راہِ ہدایت
 پر چلے۔

حد و صلوة کے بعد خدا کا یہ ضعیف ترین بندہ ولی اللہ بن عبد الرحیم
 و اللہ ان دونوں مکانہ جاویدانی نعمتوں کو بتائے ایوں عرض کرتا
 ہے کہ اس سرگزشتِ حقیقت کے دل پر بارگاہِ عالی سے الہام کے جو

نظرات چمکے، اُن میں سے یہ چند کلمات ہیں، جو میں یہاں سپردِ قلم کرتا ہوں
 کہ ہر ایک منعم پر چلنے کے یہ کلمات خود میرے سنے اور نیز میرے تابعین کے
 لئے دستور کا کام دیں، اور خدا تعالیٰ نے میرے دل میں طریقت و
 معرفت کی جو نسبت القادر فرمائی ہے، یہ کلمات اس نسبت کے لئے نمونہ
 نہیں۔ اور نیز اُن کے ذریعہ میرے اس مسلک طریقت کی تشریح ہو جائے
 جس کی مجھے ہدایت فرمائی گئی ہے۔ خدا کے علام الغیوب سے پوری
 امید ہے کہ وہ اس سلسلہ میں نفس کی خام خیالیوں سے جو فیضانی
 دوسووں سے پیدا ہوتی ہیں، اور عقل و فکر کے ان قضیوں سے جو
 بحث و استدلال کا حاصل ہوتے ہیں، نیز انسانی علوم سے جو دوسروں
 سے چڑھ کر یا ان کی باتیں سن کر ذہن نشین ہوتے ہیں، ان سب چیزوں
 سے میرے ان الہامی کلمات کو محفوظ و ناموس رکھے گا، تاکہ یہ ایک سرسبز
 سے مل سکیں اور اس طرح حق و باطل میں گمراہ ہونے کا کوئی خدشہ نہ ہو۔

میں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میرے دل میں ان
 الہامی کلمات کو تقار کرنے سے صرف میری ذات کی تکمیل یا محض میری اپنی
 تعلیم مقصود نہیں۔ بلکہ اس سے عام ملت اسلامی کی خیر و بہبود ہی منظور
 ہے۔ تو کلام من فضلہ علینا و علی الناس و لکن اکثر الناس کایطرون :
 اس مناجات سے میں نے اس کتاب کا نام جماعت رکھا ہے۔ اور
 اللہ ہی ہے جو ہمارا ملجا و ماوئی ہے۔ اور وہی سب سے بہتر وکیل اور
 تمکین ہے۔

دین اسلام کی دو حیثیتیں۔ ظاہری اور باطنی

اللہ تعالیٰ نے رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو انسانوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا، اور دین کے قیام اور دین کی حفاظت کے سلسلہ میں آپ سے نصرت و مدد کا وعدہ کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿إِنَّا لَمَعَٰنُونَ﴾ اسی امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی اس نصرت و مدد کی برکت سے ہی آپ کا دین تمام ادیان پر غالب آیا کہ دین کی اشاعت سے دراصل مقصود یہ تھا کہ عرب و عجم کے ربّ و ملائکہ کی اصلاح ہو اور ظلم و فساد کا پوری طرح خاتمہ کر دیا جائے۔

مزید برآں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دین محمدی کی دو حیثیتیں ہیں: ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ جہاں تک دین کی ظاہری حیثیت کا تعلق ہے، اس کا مقصد مصلحت عامہ کی نگہداشت اور اس کا دیکھ بھال ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ احکام و معاملات میں

ان مصلحت عامہ کے لئے بطور ذرائع اور اسباب کے ہیں۔ ان کو قائم
 علیٰ یس دایا جائے۔ اور ان کی اشاعت میں کوشش کی جائے۔ اور
 جس چیزوں سے مصلحت عامہ پر زور پڑتی ہو اور جن امور کی وجہ
 سے اس مصلحت عامہ میں تخریب ہوتی ہو ان کو سخت سے روکا جائے۔
 یہ تو ہونی دین کی ظاہری حیثیت اب رہا اس کی باطنی حیثیت کا مدعا
 یعنی مصلحت کے کاموں سے دل پر جو اچھے اثرات مترتب ہوتے
 ہیں۔ ان کے احوال و کوائف کی تفصیل دین کی باطنی حیثیت کا مقصد
 اور نصب العین ہے۔

جب یہ امر واضح ہو گیا کہ دین کی ظاہری اور باطنی دو حیثیتیں ہیں
 تو احوال میں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 دین کی حفاظت کا جو وعدہ کیا گیا تھا اس حفاظت کی یہی لازماً دو حیثیتیں
 ہوں گی۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 کا انتقال ہوا تو انہی سے حفاظت دین کا جو وعدہ کیا گیا تھا، آپ
 کی وفات کے بعد اس وعدہ حفاظت کی یہ دو خطیں پیدا ہوئیں۔ وہ
 بزرگ جن کو فہم و فہم کے طرز سے شریعت کی حفاظت کی استعداد
 تھی۔ وہ تو دین کی ظاہری حیثیت کے محافظ بنے۔ یہ فقہاء محدثین
 ائمہ اور قاریوں کی جماعت ہے۔ چنانچہ ہر زمانے میں اپنی بہت
 یہ جماعت مصروف عمل نظر آتی ہے۔ دین کی تحریک کی اگر کہیں سے
 کشش ہو تو یہ لوگ اس کی تردید میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور

نیز تعلیم و ترغیب کے ذریعہ یہ بزرگ مسلمانوں کو علوم دین کی تحصیل کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اور ان ہی میں سے ہر سو سال کے بعد ایک مجدد پیدا ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ دین کی تجدید ہوتی ہے۔ ہمیں یہاں چونکہ اس مسئلہ کی تفصیل مقصود نہیں۔ اس لئے صرف اس اشارہ پر اکتفا کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔

دین کے محافظین کا دوسرا گروہ وہ جو۔ جسے خدا تعالیٰ نے باطن دین کی حفاظت کی وجہ سے کلمہ و سرنام احسان ہے۔ استعداد عطا فرمائی۔ ہر زمانے میں اس گروہ کے بزرگ عوام الناس کے مرجع رہے ہیں۔ بلاغت و نیکو کاری کے اعمال سے باطن نفس میں جو اچھے اخلاقیات مترتب ہوتے ہیں۔ اور دلوں کو ان سے جو لذت ملتی ہے۔ یہ بزرگ لوگوں کو ان امور کی دعوت دیتے ہیں۔ اور نیز یہ انہیں نیک اخلاق اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ جوتا آبا ہے کہ ہر زمانے میں اولیاء اللہ میں سے کوئی نہ کوئی ایسا بزرگ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ جس کو عنایت انہی سے اس امر کی استعداد ملتی ہے کہ وہ باطن دین کے قیام اور اس کی اشاعت کی کوشش کرے۔ باطن دین کہ اس کا مغز اور جوڑا احسان یعنی اللہ کی اس تخلیق کے ساتھ ہمیشہ کرنا کہ گویا عبادت کرتے والے اُسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے۔ یا اگر اتنا نہ ہو تو اُسے یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔ یہ بزرگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس صفت احسان کا مظہر بنتا ہے۔ اور باطن کا

کے اہتمام اور اس کی مخالفت کا کام اس طرح اس بزرگ کے ہاتھ سے سہرا انجام پاتا ہے ۔

کھار زلفِ قست مشک افشانی ، آتا عشاق

مصلحت را چہتے برآہو کے چیں بہتہ اند

دیارِ اشتر میں جو بزرگ اس صفتِ احسان کا منظر دیتا ہے ، اس کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ لوگوں میں اس کی رفعتِ شان کا عام حیرا ہو جاتا ہے اور سلطنت اس کی طرف گہنی پٹی آتی ہے ۔ ہر شخص اس بزرگ کی تعریف کرتا ہے اور نیزجہ اذکار اور وظائف ملتِ اسلام میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں ، ان میں سے ہی بعض ایسے اوراد اور اشغال اس بزرگ کے دل پر اشتر قائلے کی طرف سے بذریعہ الہام اازل ہوتے ہیں کہ جس قوم میں یہ بزرگ پیدا ہوتا ہے اس قوم کے دلوں کو ان اوراد و اشغال سے فطری مناسبت ہوتی ہے ۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس بزرگ کی صحبت اور باتوں میں جذبِ تاثیر کی غیر معمولی قوت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور اس سے ہر طرح کی کلمات ظاہر ہوتی ہیں ۔ غرض کہ یہ بزرگ کشف و اشراق کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کا حال معلوم کر لیتا ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ کے اہد و قوت سے دنیا کے عام مسموعات میں تصرف کرتا ہے ۔ اس کی دعائیں بارگاہِ نعت میں مقبول ہوتی ہیں ۔ اور یہ اور اس قبیل کی اور کرامات اس کی ہمت و برکت سے عرض و جود میں آتی ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مریدوں و طالبوں کی ایک کثیر جماعت اس بزرگ کے ارد گرد جمع

مہربانی ہے۔ اور یہ بزرگ باطن کی تیز سیر اور اس کی اصلاح کے باعث
اور داد و تحائف کو سب سے قریب دیکھا جائیگا۔ اور اس کے
کے خاندان و مائیت کی بنیاد پر ہے۔ اور بزرگ اور اس کے مکمل پر ہے
لگے ہیں۔ اس خاندان کے کی تاثیر و برکت کا یہ عالم ہے کہ اسے اطفال اور
عمر بہت ہمارے مسلک سے فریاد ہو کر کو بیچ ہوتا ہے۔

اور خاندان سے جو شخص غلو کرے گا اس کی نافرمانی ہے
وہ تو دنیا میں نافرمانی کا بیابان ہے۔ اس کو اس خاندان سے کار چاہیے
اور اس سے قریب کرے۔ وہ نافرمانی و نافرمانی سے عوام و خواص
خواص کے دونوں میں بھی اس خاندان سے کے ماننے والوں کی میت جھا
جائی ہے۔ اور خیر و بھی مرنے کے کہ خیر تھانے کی طرف سے کچھ ایسا
پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی قدرت الہام اور عالم کے ذریعہ
نظام کائنات کے عام اصولات میں کچھ اس طرح تصرف کرتی ہے کہ وہ
اس خاندان کے مطیع و مشاوری ہو جاتے ہیں۔ یہ صورت حال اور اس

لے دیکھیں کائنات میں کئی چیزیں ہیں۔ اور الہام کے ذریعہ صورت دہ جاتی ہیں
قبض کے سنی ہیں کہ ایک چیز کی نظری مشد کو کچھ صحت ہے ہونے کا نہیں آتی بلکہ وہ ایک
خدا تعالیٰ ایک چیز کی نظری۔ خود میں خلاف اصولیت زیادہ قوت اور خیر پیدا کر دیا ہے۔ بلکہ
مطلب یہ ہے کہ خدا کی بنیاد پر کائنات کی صورت ہے لیکن خدا تعالیٰ کی صحت سے اس کی صورت نہ ہو
کر دیا ہو اور الہام کے سنی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صحت کے دل میں ایک عام کرنے کی بات ڈال۔ یہ ہرگز

خاناوے کی سطوت و برکت ایک عرصہ تک رہتی ہے۔ یہیں ایک ماہ
 گزارنے کے بعد جب عنایت الہی کہہ دے اسے شخص کی طرف متوجہ ہو جاتی
 ہے۔ اور اسے اپنے فیوض و برکات کا مرکز بناتی ہے تو یہاں سے ایک
 سہ ماہی خاناوے کی بنیاد پڑتی ہے۔ چنانچہ بہت زیادہ خاناوے اور مرض و جود
 میں آتا ہے تو اس وقت پہلے خاناوے کی حالت ایسی ہو جاتی ہے
 کہ اگر ایک جسم ہے، میں میں کہ روح نہیں رہی۔ اور چلنے والا خاناوے
 کا سبب حقیقت یہاں ہو جاتا ہے کہ اس میں جذب و تاثیر کا نام تک نہیں
 رہتا۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک سے
 زیادہ قلوب پیدا ہوں اور وہ اس طرح کہ ہر ایک میں ایک الگ
 قلوب ہو۔

باقی۔ باقی خاناوے میں جذب و تاثیر کا پایا جاتا ہے۔ اس کے
 میں اس خاص خاناوے کی ذاتی خصوصیت کا دخل نہیں ہوتا۔ جذب و
 تاثیر تو محض عنایت الہی کا نتیجہ ہے۔ جب تک کوئی خاناوہ عنایت
 الہی کا مرکز اور موضوع ہے، جذب و تاثیر اس میں رہتی ہے۔ لیکن
 جب عنایت الہی کا رخ بدل جائے تو پھر اس خاناوے سے جذب
 و تاثیر بھی غائب ہو جاتی ہے۔ اس کیوں کہنے کے ایک تالاب ہے جس
 میں کہ ستماروں کا عس پڑ رہا ہے۔ آپ تالاب کے پانی کو ہزار
 بار دیکھے، ظاہر ہے اس سے ستماروں کے ٹکڑے، پر تو کچھ اثر نہیں پڑے گا۔
 دم بدم گر ٹو دیاس بدل مرد صاحب لباس دیہ فصل

الغرض ہذب و تاثیر کے معاملہ میں اصل چیز عنایت الہی کی توجہ ہے۔ اور خانوادے تو اپنے اپنے وقت میں صرف اس عنایت الہی کی توجہ کے مرکز اور اس کے آلاکار بنتے ہیں۔ ایک خاص زمانہ میں ایک مخصوص خانوادہ عنایت الہی کا مظہر ہوتا ہے۔ اور یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر زمانے میں جو بھی قطب ہوا، خود اس کی زبان ہے، اور اس کے حواریوں کی زبان سے اکثر ایسی باتیں نکلیں جن سے مراد یہ تھی کہ اُن کا خانوادہ سب خانوادوں سے اعلیٰ اور مقدم ہے اور اللہ سے قرب و وصل حاصل کرنے کا صرف یہی ایک مسلک اور راستہ ہے۔ اس ضمن میں ہم اوپر جو کچھ لکھ آئے ہیں۔ اور عنایت الہی کے متعلق جو ہم ابھی تباحث کر چکے ہیں کہ کس طرح ایک وقت میں ایک خاص خانوادہ اس کا مرکز اور مظہر بنتا ہے، اگر یہ امور پیش نظر ہوں تو آسانی یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ یہ بزرگ سب کے سب اپنے ان دعوؤں میں پکے تھے۔

ظاہر دین کی غلبہ و اصلاح کے ساتھ ساتھ باطن دین کے تزکیہ کے لئے بھی عنایت الہی برابر انتظام فرماتی رہی ہے۔ چنانچہ جس طرح شریعت کے مجددین پیدا ہوتے رہے ہیں اسی طرح طریقت کے بھی اب تک بہت سے خانوادے ہو چکے ہیں اور بہت سے اس وقت بھی موجود ہیں اور امید ہے کہ بعد میں بھی ان کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ ان سب خانوادوں کا احاطہ کرنا یہاں منظور نہیں۔ ان میں سے

بعض خانوادے تو ایسے ہیں کہ انہوں نے پُرانے خانوادوں کی جو بے نام و نشان
جو چٹکتے گراؤ سر نو تجدید کر دی اور بعض ایسے ہیں کہ انہوں نے کئی ایک خانوادوں
کو یکجا کر کے ایک خانوادے کی شکل دے دی اور بعض نے نئے سرے پر مستقل خانوادے
کی بنیاد رکھی۔ مگر خرقہ اور بیعت میں وہ پہلوں سے غفلت رہے۔

اب یہ سلسلہ کہ کل خانوادے کتنے ہیں؟ اس کے بارے میں لوگوں میں اختلاف
پایا جاتا ہے بعض لوگ جو وہ خانوادے بتاتے ہیں، جن میں سے سب سے مشہور زیدی
علیائی، ابوبی، ہمسری، ہشتی، بنیدی اور گارزدنی ہیں۔ اور بعض کے نزدیک کل
خانوادے بارہ ہیں۔ ان میں سے تو دس تو مقبول ہیں اور باقی دو مردودان دس میں
سے مشہور حلیہ، محاسبہ، حقیقہ، نور، اور طغفیر وغیرہ ہیں۔ الغرض ایک زمانہ تک
تو یہی خانوادے رہے۔ اس کے بعد ایک وقت آیا کہ ان کے علاوہ دوسرے
خانوادے بھی پیدا ہو گئے، مثلاً جامیہ، قادیان، اکبریہ، مہروریہ، اکبرویہ، دوسویہ
اور خانوادہ خواجگان، سرزمین ہند میں سنی طریقہ کو حضرت عین الدین اجمیری نے
از سر نو زندہ فرمایا۔ اور ان سے خانوادہ عینہ چلا۔ اور خانوادہ خواجگان کی نقشبندی
سلسلہ نکلا۔ اور نقشبندی سلسلہ کے چل کر حضرت عبید اللہ احرار سے احرار خانوادہ
بنا۔ اس کے بعد چوں چوں زمانہ گزرتا گیا۔ نئے نئے خانوادے معرض وجود میں آئے مگر
جیسے شیخ عبداللہ دس گنگوہی کی قدوسی سلسلہ نکلا۔ شیخ محمد غوث گویا راری کی غوثیہ طریقہ
چلا۔ خانوادہ باتویہ جو خواجہ بابائی باشر سے منسوب ہے۔ اور احمدیہ خانوادہ جس کے بانی
شیخ احمد سرہندی ہیں۔ اور خانوادہ آدمیہ جو شیخ آدم بنوری کی طرف منسوب ہے۔ اور
علانیہ جس کا سلسلہ امیر ابوعلی ہے چلتا ہے۔ ان خانوادوں کے علاوہ اور بھی بہت سے

خانوادے میں جو وہیں آکر جن میں سے بعض تو اس وقت تک موجود ہیں اور بعض کا اب کوئی نشان نہیں ملتا۔

مجھ ضعیف پر حتیٰ سبحانہ کا یہ جزا احسان ہے کہ اس نے مجھے ان تمام خانوادوں میں سے اکثر کے ساتھ ظاہری اعتبار سے ربط پیدا کرنے کی سہولت بخشی۔ چنانچہ اس کا ذکر میں نے اپنی کتاب "انتباہ فی الحلال" اولیا اثر میں کیا ہے۔ نیز اس سلسلہ میں جو کچھ میں نے اس کتاب میں لکھا ہے، اگر کسی صاحب کو ان خانوادوں کے حالات کی خبر ہو تو وہ آسانی سے میری ان تحریروں سے اندازہ کر سکتا ہے کہ مجھے کن کن خانوادوں سے ربط دار تھا ہے۔ اس ضمن میں مثال کے طور پر صرف اشاعرہ کے ناموں کے مجھے سلسلہ مدارج سے جو اسطے شیخ مسعود الدین ناگپوری جو شیخ بدیع الدین مدار کے اصحاب میں سے تھے، اور جلالہ اور گاروینہ سلسلہ سے جو اسطے مخدوم جہانیاں اور جامیہ سلسلہ سے جو اسطے خواجہ مودود چشتی اور نیز ولیو یہ سلسلہ سے جو تھانہ خواجہ نقشبند نسبت حاصل ہے۔ اور اکثر اوقات اس عاجز کو ان اصحاب کی اروج کی بنا پر اپنی برافض قرار ہے۔ چنانچہ اسی کا اثر ہے کہ میں نے ان میں سے ہر خانوادے کی نسبت کو اپنے باطن میں علیحدہ علیحدہ اور رک کیا لیکن یہ مسائل ایسے نہیں کہ میں یہاں مختصر طور پر ان کا ذکر کروں تو ان کا حق اور حوائج ان کے لئے تو بڑی تفصیل چاہئے۔ بہر حال میرے پیش نظر یہ اصول بھی ہے کہ جب کسی چیز کا پوری طرح احاطہ ممکن نہ ہو تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اسکا بالکل ذکر ہی نہ کیا جائے۔

تصوف کے چار دور

بھو نصیر کو اس حقیقت سے جی آگاہ کیا گیا ہے کہ تصوف کے طریقوں میں سے اب تک چار بڑے بڑے تغیرات ہو چکے ہیں۔

(۱) تصوف کا چاروا دور۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کے زمانے میں چند سکون تک اہل کمان کی بیشتر قوس زیادہ زبردست کے ظاہری اعمال کی طرف رہی۔ ان لوگوں کو اپنی زندگی کے ہر مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل ہی میں حاصل ہو جانے تھے۔ چنانچہ ان بزرگوں کا اسان یعنی حاصل تصوف یہ تھا کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے، ذکر و تلاوت کرتے تھے، روزے رکھتے تھے، حج کرتے تھے، صدقہ اور زکوٰۃ دیتے تھے، اور خدا کرتے تھے۔ ان راستے کوئی شخص ایسا نہ ہوتا جو سر نیچے گئے بھرتوں میں غرق تھا کہ یہ بزرگ خدا تعالیٰ سے قرب و محبت کی نسبت اعمال و فریاد اور

ذکر و اذکار کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے۔ بیشک ان اہل کمال بزرگوں میں سے جو محقق ہوتے، ان کو نماز اور ذکر و اذکار میں لذت ملتی۔ اور قرآن مجید کی تلاوت سے وہ متاثر ہوتے۔ مثلاً وہ زکوٰۃ محض اس لئے نہ دیتے کہ زکوٰۃ دینا خدا کا حکم ہے بلکہ خدا کے حکم کی محبت اور ہی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بخل کے روگ سے بچانے، اور نیز جب وہ اپنے آپ کو دنیاوی کاموں میں بیکار نہ بننے کا احساس ہوتا چنانچہ وہ دل کو کاروبار و دنیا سے ہٹانے کے لئے زکوٰۃ دیتے۔ اور اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام کو بجالانے میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ لہٰذا محض یہ بزرگ محض خدا کا حکم سمجھ کر شرعی احکام ادا نہ کرتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان شرعی احکام کی بجا آوری کو ان کے باطنی تعلقوں کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی شخص نہ بے ہوش ہوتا اور نہ اسے وجد آتا اور نہ وہ ہوش میں آکر کچھ بچاؤ لے لگتا اور نہ شطیع یعنی غلط شرع کوئی غلط اس کی زبان سے نکلتا۔ یہ بزرگ تجلیات، ہستیا اور اس قسم کے دوسرے مسائل پر مطلق گفتگو نہ کرتے تھے۔ یہ بزرگ ہیئت کی رغبت و آرزو رکھتے اور دوزخ و مخالف دہر سے بے کشف و کرامات اور خوارق ان سے بہت کم ظاہر ہوتے۔ اور سستی و بخود کی کیفیت بھی شاید و ناوری ان پر ظاہری ہوتی۔ اور اگر کبھی کبھی یہ باتیں ان سے صادر بھی ہوتیں تو قصداً نہیں بلکہ محض اتفاق سے ایسا ہوتا۔ بات یہ ہے کہ وہ نفسی کیفیات جن کا نتیجہ کرامات و خوارق و سستی و بخود کی قبیل کی چیزیں ہوتی ہیں، یہ کیفیات ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہ ہوئی تھیں کہ وہ نگاہ بن جائیں چنانچہ

اس ضمن میں جب کبھی اُن سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی تو یا تو اس کی صورت یہ تھی کہ وہ جس چیز کو اذروئے ایمان مصمم قلب سے مانتے تھے وہ چیز بے اختیار اُن کی زبان پر آ جاتی، جیسا کہ حضرت ابو بکر نے مرض الموت میں اپنے بیمار داروں سے فرمایا تھا کہ ”طیب ہی نے مجھے بیمار کیا ہے۔“ یا یہ ہوتا کہ یہ بزرگ خواب میں بعض چیزوں کو دیکھ لینے یا فراست سے نامعلوم چیز کو معلوم کر لیتے، لیکن یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی ان تک رسائی نہ ہو سکتی۔
تفصیل مختصر اس دور میں جسے تصوف یا ”احسان“ کا پہلا دور کہنا چاہیے۔ اہل کمال کا غائب طور پر یہی حال رہا۔

(۲) تصوف کا دوسرا دور — حضرت جنید جو گروہ صوفیہ کے سرخیل ہیں۔ ان کے زمانے میں یا ان سے کچھ پہلے تصوف کے ایک اور رنگ کا ظہور ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ ہوا کہ اہل کمال میں سے عام طبقہ تو اسی طریق پر کار بند رہا جس کا ذکر پہلے دور کے ضمن میں ہو چکا ہے لیکن ان میں سے جو خواہش تھے۔ انہوں نے بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ اور دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا اور مستقل طور پر وہ ذکر و فکر میں لگ گئے۔ اس سے اُن کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کیفیت سے مقصود یہ تھا کہ دل کو تعلق یا شد کی نسبت محال ہو جائے۔ چنانچہ یہ لوگ اس نسبت کے حصول میں لگ گئے۔ وہ

ماتوں مرا تہے کرتے۔ اور ان سے تھلی استثناء، افسوس اور
وحشت کے احوال و کوائف ظاہر ہوتے، اور وہ اپنے
ان احوال کو نکات اور اشارات میں بیان بھی کرتے،
ان اہل کمال میں سے سب سے صادق وہ بزرگ تھے
جنہوں نے اپنی زبان سے وہی کہا، جو خود ان پر گزرا تھا، یہ لوگ
سماخ کہتے، سرستی و بے خودی میں بے ہوش ہو جاتے، کپڑے پھاڑ
اور رقص کرتے، یہ کشف و اشراق کے ذریعہ دوسروں کے دلوں
کی باتیں بھی معلوم کر لیتے تھے۔ انہوں نے دنیا سے اپنا رشتہ توڑ کر
پہاڑوں اور صحراؤں میں پناہ لی اور گھاس اور پتھروں پر زندگی گزارا
اور گدڑیاں بٹھنے لگے، نفس و شیطاں کے مکروں اور دنیا کے فریبوں
کو یہ خوب سمجھتے تھے۔ اور ان سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے یہ لوگ
مجاہدے بھی کرتے تھے، الغرض اس دور کے اہل کمال کا تصوف یہ
تھا کہ وہ خدا کی عبادت و وزیع کے عذاب سے ڈر کر یا مست کی
نعمتوں کے طمع میں نہ کرتے تھے، بلکہ ان کی عبادت کا محرک خدا
کے ساتھ ان کی محبت کا جذبہ ہوتا۔

لیکن تصوف کے اس دور میں ”توحید کی نسبت اپنے درجے
کو اتنی تک نہیں پہنچی تھی۔“ اس سے یہاں مراد نفس کا پوری طرح حقیقت
الغالبی یعنی ذات خداوندی کی طرف متوجہ ہونا ہے، اور وہ اس
طرح کہ نفس اندہ کے جنگ میں کلیتہً رٹکا جائے اور نیرو دنیا کی

ماضی اور خافی چیزوں پر پوری طرح غالب آجائے تصوف کے اس دؤر میں "توجہ" کی نسبت دوسری چیزوں سے علیٰ ہلی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں ان اہل کمال میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے کہ خاص "توجہ" کو ان معنوں میں اپنا نصب العین بنایا ہو کہ وہ ہمیشہ اُسی کی بات کرتا، اور اسی طرف اس کا ہر اشارہ جوتا یا اس زمانے میں یہ صورت ہوتی کہ ان میں سے کسی شخص نے "توجہ" کی نسبت مسلسل کرنے کی راہ بتائی ہوئی۔ اہل بات یہ ہے کہ ان بزرگوں پر طاعت کا رنگ غالب تھا، اور طاعت کے انوار سے وہ سرشار تھے۔ بیشک انہیں "توجہ" کی نسبت حاصل ہوتی تھی، لیکن گاہے گاہے جیسے کہ بجلی کی چمک کہ ابھی ہے، اور ابھی نہیں

شب خیالِ طرہ شوخِ دلِ خمیدہ و رفت

سامنے ہم چوں شبِ قدرِ زبرم جو خید و رفت

۴) تصوف کا تیسرا دور۔۔۔ سلطانِ مرقیہ شیخ ابوسعید بن ابی الخیر اور شیخ ابوالحسن غزنوی کھڑائے صہا طریق تصوف میں ایک اور تغیر دونا ہوتا ہے۔ اس دور میں یہ حال میں سے عوام توجہ سابق شرعی اور امر و اعمال پر مشرک رہے۔ اور خواص نے باطنی احوال و کیفیات کو اپنا نصب العین بنایا، اور جو خواص ان خواص تھے، انہوں نے اعمال و احوال سے گزر کر "جذب" تک رسائی حاصل کی اور اس "جذب" کے نام سے ان کے سامنے "توجہ" کی نسبت کا راستہ کھل گیا۔

اور اسی سے نعمات کے سب پر دے اُن کے لئے چلک ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی ایک ذات ہے جس پر تمام اختیار کے وجود کا انحصار ہے۔ اور وہی ذات سب اختیار کی قیوم ہے۔ یہ لوگ اس ذات میں گم ہو گئے۔ اور اس کے رنگ میں ان کے نفوس رنگ گئے۔ چنانچہ اس حال میں نہ ان کو اوراد و طاعت کی جذبات ضرورت رہی اور نہ انھیں مجاہدے اور ریاضتیں کرنے اور نفس اور دنیا کے فریبوں کو جاننے کی ضرورت رہی۔ ان کی تمام تر کوشش کا مقصد یہ ظہیر اکرم میں طرح بھی ہوا تو جہ کی نسبت کی تکمیل کریں تو جہ کے علاوہ باقی جو نسبتیں ہیں یہ لوگ انھیں نورانی مجاہد سمجھتے تھے۔ اس عہد میں توحید و جہود اور توحید شہود میں فرقت نہیں کیا جاتا تھا۔ مہمشت ان بزرگوں کی اصل غایت یہ تھی کہ ذات الہی میں اپنے وجود کو گم کر کے اس مقام کی کیفیات سے لذت اندوز ہوں چنانچہ وہ اس بحث میں نہیں پڑتے تھے کہ کائنات کا وجود الہی سے کیا علاقہ ہے؟ اور انسان خدا کی ذات میں یکے کم جوتا ہے؟ اور خدا و بھائے کیا خالق ہیں؟

(۴) تصوف کا چوتھا دور۔۔۔ آخر میں شیخ اکبر محی الدین بن عربی (۵۶۰ھ) اُن سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد میں ان اہل کمال بزرگوں کے دہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے اور یہ لوگ کیفیات و احوال کی منزل سے آگے بڑھ کر مقامی تصوف کی بحث و تدقیق کرنے لگتے

ہیں۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی، ان بزرگوں نے ظہور وجود کے مراحل اور تنزلات دریافت کئے۔ اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا اور کس طرح یہ صدور عمل میں آیا۔ الغرض یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل، ان لوگوں کے لئے موضوع بحث بن گئے۔

تصوف کے ان چاروں دوروں میں جو بھی اہل کمال بزرگ گزریے ہیں، گو وہ اپنے ظاہری اعمال و احوال میں الگ الگ نظر آتے ہیں، لیکن جہاں تک ان کی اصل کا تعلق ہے میرے نزدیک وہ سب ایک ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ ان کے سال کو ہم سب سے بہتر جانتا ہے۔ ان بزرگوں میں سے جب کسی نے اس دنیا سے انتقال فرمایا تو جو باطنی کیفیت اس بزرگ نے اپنی ہمت اور ریاضت سے دل میں پیدا کر لی تھی، وہ کیفیت موت کے بعد بھی اس بزرگ کے نفس میں جاگزیں رہی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی آئینہ یا پانی کا حوض ہو۔ اور اس میں آفتاب کا عکس پڑ رہا ہو۔ ان بزرگوں کی طفیل مبداء اول یعنی خدا تعالیٰ ہمک پہنچنے کا راستہ قریب ہو گیا اور ان کے فیوض و برکات کے انوار سے عالم علوی اور عالم سفلی کی فضا مستنیر ہو گئی جیسے کہ ہماری اس آسمانی فضا میں جب مریخ، عطارد اور بادل پھیل جاتے ہیں، تو اس کا اثر زمین پر بھی پڑتا ہے۔ اسی طرح ان نفوس قدسی کی کیفیات بھی دنیا کے قلوب پر اپنا اثر ڈالتی رہتی ہیں۔

الغرض تصوف کے یہ چاروں کے چاروں طریقے خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہیں اور علامہ اعلیٰ میں بھی ان سب کی منزلت مسلم ہو اور باب تصوف پر بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے ہر طبقے کے اقوال اور احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جاننا چاہئے۔ اس سلسلہ میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے اور باب تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے سیاروں سے ناپتے پھر دیں۔

سلوک کی پہلی منزل۔ طاعت

میں شخص کو بھی مشائخ تصوف کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع نصیب ہوا ہو گا یا اس نے اہل تصوف کی کتابیں اور رسائل شریعت میں پڑھے ہوں گے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تردد نہ ہو گا کہ تصوف کے سب طریقوں کے بزرگوں اور ارباب ارشاد کی غالب اکثریت یقیناً اس امر پر پورا اتفاق رکھتی ہے کہ طریقت کی اصل ایک ہے۔ اگر اہل فرق کے سلوک میں راہیں الگ الگ ہو گئی ہیں۔

طریقت کی یہ اصل میرے آگے چل کر ہر فرق تصوف نے سید الطائفہ جنید بغدادی کی طرف منسوب ہے۔ اس لئے کہ حضرت جنید ہی وہ پہلے بزرگ ہیں، جنہوں نے ان کے اکثر قریب اقوال میں کوہِ طہ کیا۔ چنانچہ موصوف کے زمانے میں جو بھی اہل تصوف تھے، ان سب نے اپنے سلوک کی نسبت حضرت جنید سے ٹیک کی تھی۔ یہی وجہ ہے

تو طریقت کا جو بھی سلسلہ اس وقت موجود ہے، اس کا اصل سر مشیخ حضرت
 جنید ہی کی ذات گرامی ہے۔ بے شک اس ضمن میں ایسا بھی ہوا کہ کسی
 شخص کا طریقہ تو ادنیٰ ہو، اور ظاہری اعتبار سے اس نے کسی اور طریقہ
 کا فرقہ بن لیا، جیسا کہ شیخ عبد اللہ بن مبارک نے، یا کبھی ایسا ہی ہوا ہے
 کہ ایک شخص بہت سے مشائخ کی صحبت میں بیٹھا، لیکن اس کی ولی مراد
 حضرت غیبیؑ، دوست گیری سے برائی ہو، اور اس نے اس خیال سے کہ
 ایک تو حضرت جنید کا مرتبہ مشہور و معروف ہے، اور دوسرے اُن کی
 وجہ سے قرب الی اللہ کا واسطہ در واسطہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔
 مناسب یہ سمجھا ہوا کہ حضرت جنید کو جو اس کے لئے شیخِ اول کا درجہ رکھنے
 تھے، دوسرے مشائخ پر مقدم قرار دے، اور اپنے آپ کو حضرت جنید
 ہی کی طرف منسوب کرے جیسے کہ شیخ عشاء دینوری نے کیا۔

جس طرح تمام، بل تصوف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ طریقت کے
 سب سلسلوں کی اصل ایک ہے، اسی طرح یہ سب بزرگ اس امر میں
 بھی متفق ہیں کہ سالک راہ طریقت کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ

نہ ادبی طریقہ حضرت، دس قرنی کی طرف منسوب ہے، ان کے متعلق مشہور یہ ہے کہ موصوف
 رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھا اور گواہی عاقبات میں ہوئی، لیکن انہوں نے غیر
 عاقبات کے روحانی طور پر آنحضرت صلی علیہ وسلم سے فیض لیا، ایک شخص جب کسی گزشتہ ہونے
 بزرگ کی رو سے فیضان حاصل کرتا ہے تو اس طریق فیض کو ادبی کہتے ہیں۔

وہ اپنے عقائد کو درست کہے۔ بنا ٹیپہ اس ضمن میں آست سماج تاملین اور سٹن مسالین کے عقائد کو پہنچنے کے متعلیٰ راہ بنانا چاہیے۔ عقائد کو درست کرنے کے بعد اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے مسلمانوں کو بھائے۔ گناہوں سے بچے۔ شرعیات سے جن مفاسد کو لکھون قرار دے۔ ان کا سد باب کرے یہ راہ طریقت کا پہلا مقام ہے اور اس کا نام طاعت ہے۔ طاعت و حقیقت تصور، اور انسان کی اصل جہت ہے کہ اس کے بغیر طریقت اور سلوک کبھی درست ہو ہی نہیں سکتے۔

قبل اس کے ہم آگے بڑھیں۔ یہاں تین باتوں کی وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں تک عقائد کی درستگی و تحقیق ہے۔ ساکھ اس میں سماج تاملین اور سٹن مسالین کے عقائد کو اپنا نمونہ بنانا چاہیے۔ چنانچہ بعد میں مضمون کے عقائد میں جو نئی نئی تاملین کی ہیں ان سے بیکار ضروری ہے۔ اور پھر خاص طور پر جن عقائد میں متقدمین نے تاویل کی ضرورت نہیں سمجھی اور نہ انہوں نے ان عقائد کی اس طرح تاویل کی ہے کہ ایک راستے کو دوسری راہوں پر ترجیح دے کر صرف اُسے ہی وہ اصل مراد قرار دے دیتے۔ ساکھ کو چاہیے کہ وہ بھی اسی طریق پر ان عقائد کو مانے۔ دوسری بات میں لاکھ ساکھ کو خیال رکھنا ضروری ہے۔ وہ ہے کہ سلوک کی بنیادیں وہ وحدت الوجود اور وجود کے نزوات

غمسہ کی بجٹوں سے بچے۔ ان بجٹوں سے بجائے فیض کے اٹا اُسے نقصان ہوگا۔ واجب الوجود سے یہ محسوس کائنات کیسے ظہور پذیر ہوئی اس کو سمجھانے کے لئے اہل طریقت نے پانچ تنزلات اُتارے ہیں۔ ایک تو ذات احد کا درجہ ہے۔ اس سے دوسرا تنزل وحدانیت میں ہوا، تیسرا تنزل ارواح کا ہے۔ چوتھا عالم مثال اور پانچواں تنزل عالم اجسام کا یہ ہیں وجود کے تنزلات غمسہ۔ اور مسئلہ وحدت الوجود میں اس عقدے کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وجود کے یہ مختلف مراتب حقیقتاً ایک وحدت ہیں یا یہ محض دیکھنے میں ایک نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے تنزلات غمسہ اور وحدت الوجود کے یہ معاملات بے صدا ازگ اور توفیق میں۔ اس لئے سالک کو ابتدا سے سلوک میں اُنکی سے بحث لازمی ہے۔

تیسری بات جس کا کہ سالک کو خیال رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اگر وہ اپنی علمی استعداد نہیں رکھتا کہ حدیث کی کتابوں اور صحابہ و تابعین کے آثار کا براہ راست مطالعہ کر سکے، تو اسکے لئے ضروری ہے کہ وہ فقہ کے بارِ ذمہ میں سے کسی ایک مذہب کی تقلید کرے لیکن اگر سالک میں حدیث و آثار سے استفادہ کر سکیں، امتداد و موجود ہے تو بہتر ہے کہ وہ خود اپنی کامطالعہ کرے۔ اور اس ضمن میں خاص طور پر یہ بات کی احتیاط کرے کہ بعد کے فقہانے طرح طرح کی جو بیکار فقہی مویشگافیاں کی ہیں اور جو نئے نئے مسائل انہوں نے ایجاد کئے ہیں، وہ ان میں مشغول نہ ہو۔

ذکر وادکار اور اود ووظائف

مقام طاعت کے بعد مالک کو چاہیے کہ وہ اپنا تمام وقت ذکر وادکار، تلاوت، نماز اور نوافل میں صرف کرے۔ نیز وہ اپنے اخلاق حاصل کرنے اور بری باتوں مثلاً ریاکاری، عداوت اور غیبت وغیرہ سے بچنے میں کوشاں ہو۔ اس ضمن میں تین باتوں کا جاننا ضروری ہے ایک یہ کہ صوفیائے ہر گروہ کے اپنے اپنے اور اود و نوافل کے طریقے ہیں۔ حضرت غوث اعظم قدس سرہ نے اپنی کتاب غیۃ الطالبین میں اور اود و نوافل و طاعات کا ایک طریقہ تلقین فرمایا ہے۔ اور ہشتی مشکاتی نے دوسرا طریقہ مقرر کیا ہے۔ شیخ ابوالحسن شاذلی نے اس سلسلہ میں حزب البحر کا ورد تجویز فرمایا ہے۔ عہد برید علی ہمدانی

آلہ تار، دارالحدیثی کتاب الموعود حزب البحر میں فرماتے ہیں شیخ ابوالحسن شاذلی تجویز فرمایا ہے۔ (جواب ۱۰۰)

ہا ہے کہ طریقہ عربی رو سیہ کی بنیاد اسرار العلوم کے انہی اور پہرہ اور
 اس طریقہ کے بزرگ نسل بعد نسل اپنے بعد کے آنے والوں کو اسرار
 علوم ہی کے اور اس کی تکفین فرماتے اور اسی کتاب کے مطالعہ کی
 رایت کرتے رہے ہیں۔ کو یہ سب اور اور ملائف اچھے اور مقبول
 ہیں، لیکن ان میں بہتر اور زیادہ پسندیدہ وہ اور اس جو صحیح کتب احادیث
 کے مطابق ہیں۔

دوسرے یہ کہ سالک کو ابتدا کے سلوک میں ریاض کاری کی چھوٹی
 چھوٹی تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اس ضمن میں کتب حدیث و
 سنت میں ریاض کاری کے متعلق جو مولیٰ مولیٰ باتیں بیان کی گئی ہیں
 اس کے لئے صرف ان کا بیان لینا کافی ہے۔ لیکن اگر سالک اس
 پر اکتفا نہ کرے گا۔ اور ریاض کاری کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی کریمہ میں
 رہے گا۔ تو اس سے نہ صرف یہ کہ اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ
 اس کی وہ سے الٹ اس کا دماغی توازن بھی متزلزل ہو جائے گا۔

سالک کا ابتدا کے سلوک میں ریاض کاری کی تفصیلات کی کریمہ
 میں لگ جانا ایسا ہی ہے۔ جیسے کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کو جھڑپے
 سے اتھاڑا دے کہ جھڑپے کے خیال ہی سے اس کی خیر اڑ جائے۔
 اور اس کے ذہن کے مارے اس کا اطمینان کیسے جاتا رہے۔ اس کے
 برعکس باب ۵ یہ فرض ہے کہ بے شک جھڑپے کے پہنچنے کے جو بھی
 رائج ہو سکتے ہیں، ان کا سبب اب کر دے۔ اور اُسے موقع نہ دے

کہ وہ بیٹے کے مطلق دہم و احتال میں پڑ جائے۔ بلکہ باپ کو چاہیے کہ وہ بیٹے کی اچھی طرح تربیت کرے، اس کو توانا و تندرست بنائے اور اس پر واضح کر دے کہ مضبوط آدمی بیٹے کو خود اپنے بل بوتہ پر ذریعہ کر سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں سالک کی تربیت کا زیادہ مفید اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ مرشد اس کو ایسے اذکار و وظائف میں لگائے جو محبت انگیز ہوں اور جن کی وجہ سے سالک کی توجہ دنیا کی پست اغراض سے ہٹ کر اعلیٰ اور ارفع مقاصد کی طرف مبذول ہو جائے۔ چنانچہ اس راہ کی سب سے پہلی ضرورت سالک کے اندر اسی ضرورت کو پیدا کرنا ہے۔

سالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل سے جاہ و مال کی محبت کو کم کرنے کی جہاں تک ہو سکے کوشش کرے۔ یعنی وہ اپنی توجہ کو جاہ و مال سے اس قدر منہا کرے کہ جب وہ ذکر و اذکار میں مشغول ہو تو اسے کوئی چیز دنیا کی طرف نہ کھینچ سکے۔ تاکہ ذکر و اذکار میں اسے پورا اطمینان حاصل ہو اور اس دوران میں دھڑک دھڑکے خیالات اس کے دل کی طرف راہ نہ پاسکیں اور نیز اس ضمن میں اس کو اپنے اوپر اتنا قابو حاصل ہونا چاہیے کہ جب وہ اس بات کا دعوے کرے کہ اُسے اگر محبت ہے تو صرف خدا سے، اور اس کا مقصود مطلوب ہے تو صرف وہی ذات، الغرض جب وہ یہ

دھوے کرے تو اس وقت اس کا دل اس دعوے کی تکذیب نہ کرے
اور اس معاملہ میں اس کا دل اس کی زبان کی پوری تائید کر رہا ہو۔
اور اگر نہیں تو خواہ وہ کتنے درد و غم سے گئے گا، اُسے ہم حلاوت
ذکر نصیب نہیں ہوگی۔

تیسرے یہ کہ سلسلہ نقشبندیہ کے بعض صوفیاء یہ گمان کرتے ہیں کہ ہمارے
طریقے میں سرے سے اوراد و وظائف ہی نہیں ہیں، ان لوگوں کا
یہ کہنا اس صورت اور ان معنوں میں ٹھیک نہیں۔ اور یہ یکے ہو سکتا
ہے کہ صبح و شام اور سوتے وقت کے اذکار و وظائف صحیح احادیث
میں مروی ہوں اور یہ روایات اتنی مشہور بھی ہوں، اور اس کے باوجود
حضرت خواجہ نقشبند اوراد و وظائف کا کلیہ انکار کر دیں۔ دراصل
بات یہ نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت خواجہ
نقشبند اوران کے پیروؤں نے اوراد و وظائف کے معاملہ میں اپنی
طرف سے کچھ کہنے کی بجائے ان کے مسئلہ کو کتب حدیث کے حوالے
کر دیا ہے۔ اور وہ خود اوراد و وظائف کی ترتیب اور تعلیم
میں نہیں پڑے۔ اور چونکہ بعد کے صوفیاء نے جو اذکار مقرر کر
لئے تھے، صلیح اور مشہور حدیثوں میں ان اذکار کی کوئی اصل موجود نہ
تھی۔ اس نے خواجہ نقشبند اوران کے اتباع نے ان اذکار کا
تکلم نہیں فرمایا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سنت کے مطابق
جو اوراد و اذکار تھے، صرف ان کی پیروی کو اہم سمجھا۔ اور یہ عام

قاعدہ جی ہے کہ جب ایک ہی معاملہ کے متعلق بہت سی مصلحتیں جمع ہو جائیں، تو جو مصلحت سب سے اہم ہوگی، اُسی کو عملاً ترجیح دی جائے گی۔ غرضیکہ اوراد و وظائف کے متعلق خواجگان نقشبندیہ کا یہ فیصلہ اسی فیصل سے ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر کسی صاحب کو اس مسئلہ میں شک ہو تو اُسے مولانا یعقوب چرخئی کا رسالہ انسبیہ دیکھنا چاہیے اور نیز اُسے خراسن نقشبندیہ کے اس جامع معانی کلمہ پر کہ ”ہمارے طریقے کی بنیاد احادیث و آثار کے اتباع پر ہے۔“ غور و تأمل کرنا چاہیے۔

آداب سلوک

ساک کو باخود دن رات میں پچاس رکعتیں ضرور پڑھنی چاہیے۔
 سترہ رکعتیں فرض نمازوں کی بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ و گیارہ رکعت
 شعبہ دو رکعتیں اشراق کی۔ اور چار رکعتیں نمازِ غصلی اور چار رکعتیں نماز
 زوال کی۔ یہ کل پچاس رکعتیں ہوں گی۔ اس کے علاوہ صبح و شام اور سوتے
 وقت کے جواز کا روز و رات صبح و شام و عشاء میں ہر دو میں، ساک کو
 ان کا ذکر بھی کرنا چاہیے۔ مجھے والدِ قدس سرہ نے ذکرِ غنی و اثباتِ غنی
 کا ارشاد کوہزار بار روزِ مستقل طور پر کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔
 آپ کا ارشاد تھا کہ کچھ ذکر تو مہذب و ازب سے ہو۔ اور کچھ آہستہ آہستہ غنی
 طور پر۔ ساک کو چاہیے کہ جتنا وہ زیادہ سے زیادہ ورد و استغفار
 پڑھ سکے، پڑھے۔ نیز کھر کے وقت سبحان اللہ و بحمدہ کا سو بار اور اسی
 طرح قال اللہ و مدہ کا شریک کا سو بار ورد کرنا اپنے اندر بڑی برکت

رکھتا ہے ۔

روزوں کے معاملہ میں ضروری ہے کہ سالک حج و عاصورہ کا روزہ رکھے ۔ اور ہر مہینہ میں جب بھی چاہئے ، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے تین روزے رکھے ۔ اور اسی طرح شوال کے بھی چھ روزے رکھے ۔ صدقہ و خیرات کے ضمن میں سالک کو چاہئے کہ وہ ہر روز اپنے مال سے ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور صدقہ فطر اور دوسری ضروری خیراتوں کے علاوہ ہر سال ایک مسکین کو لباس بھی پہنائے ۔ اگر سالک قرآن کا حافظ ہے تو ہفتے میں ایک بار اسے قرآن ختم کرنا چاہئے ، لیکن اگر اُسے اوراد و وظائف اور دوسرے باطنی اشتغال زیادہ کرنے پڑتے ہوں تو وہ دن میں زیادہ سے جتنا بھی قرآن پڑھ سکے ، پڑھیے ۔ اور جو سالک حافظ قرآن نہ ہو اُسے چاہئے کہ ہر روز تقریباً سو آیتیں جو باؤ پارے یا نصف پارے کے برابر ہوتی ہیں ، تلاوت کرے ۔

تعلیم و تعلم کے سلسلہ میں سالک کو یہ کرنا چاہئے کہ ہر روز حدیث کے دو تین صفحے پڑھے اور قرآن کے دو رکوعوں کا ترجمہ سُنئے کھائے پینے کے متعلق اُسے چاہئے کہ اگر وہ مزاج کا قوی ہے تو اُتنا کھائے کہ اگر وہ اس سے کم کھائے پر رہے تو اُسے ضعف محسوس ہو ۔ لیکن اگر وہ مزاج کا ضعیف ہے تو اس قدر کھائے کہ اُسے پیٹ کے تردد سے نجات مل جائے ، یعنی نہ اُتنا ہو کہ اُسے بھوک ملے اور نہ اس قدر کہ وہ سیری محسوس کرے ۔

جاگنے کے معاملہ میں سالک کو چاہیے کہ وہ دن رات کے تین حصے کرے۔ ان میں سے دو حصے تو وہ جاگے۔ اور ایک حصہ وہ سوئے اور اس کے جاگنے اور سوئے کی ترتیب یہ ہو کہ دوپہر کو تھوڑی دیر استراحت کرے۔ اور پھر جو بھائی رات تک جاگتا رہے۔ اس کے بعد سوئے اور رات کے آخری حصے میں جاگے اور فجر جب صبح کا ذب ہو تو تھوڑا سا ادھو کرے۔ اس کے بعد بیدار ہو اور غافل ہو کر سہرا کے پہلے حصے میں زیادہ جاگے یا آخر رات میں زیادہ جاگے۔ یہ سالک کے اپنے اختیار میں ہے۔ جیسے اس کے جی میں آئے۔ کرے۔

عزت اور گوشہ نشینی کے ضمن میں سالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں میں بہت کم بیٹھے۔ لیکن جماعت کی طرف سے سالک پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ سالک کی طرف سے ان میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ مثلاً اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیمار کی عبادت اور مصیبت زدہ کی تعزیت کرے۔ عزیز و اقارب کے جو صلہ رحمی کے حقوق ہیں انہیں بجا آئے بجا پس علم میں بیٹھے۔ سالک کو چاہیے کہ اپنی طبیعت کی درستگی دنگی کو دور کرنے، اور نیز اس طرح کے دوسرے امور کی اصلاح کے لئے تو وہ لوگوں سے ضرور ملے ملے لیکن اگر مفاصلہ میں نظر نہ ہوں تو اسے لوگوں سے بل جمل کم رکھنا چاہیے۔

نیز سالک کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے لباس میں

یا اپنے پیشے میں دوسروں سے ممتاز اور الگ نظر آئے۔ مالک کو چاہئے کہ وہ اپنے بھائیوں اور خاندان والوں کی سبکی وضع قطع رکھے چنانچہ اگر وہ علماء کے طبقے میں سے ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ علماء کی روش اختیار کرے۔ اور اگر وہ اہل حرفہ میں سے ہے تو ان کی وضع پر ہے۔ اور اگر وہ سپاہی ہے تو سپاہیوں کی وضع اختیار کرے۔

ذکر کے آداب

سالمک جب طاعات اور ذکر و اذکار کے معنوی نتائج کو اپنے اندر قائم و مستقر کرے تو پھر اُسے اوراد کو اوراد سمجھ کر ان کا وظیفہ نہ کرنا چاہیے، بلکہ وہ اس طرح ذکر کرے جس طرح کو اہل عشق و محبت ذکر کرتے ہیں۔ ذکر کے معاد میں سب سے زیادہ خوش نصیب وہ ہے جو عجمی مزاج ہو، اور اس میں جذبہ عشق و محبت کی شدت ہو، لیکن برکت طبعاً کامل ہو یا اس کے مزاج میں فطرتاً کوئی خلل ہو یا اس پر عشق و محبت کا زیادہ اثر نہ ہوتا ہو، تو اُسے ذکر و اذکار میں اعلیٰ مقام تک رسائی نصیب نہیں ہوتی،

جمہور اہل طریقت کے نزدیک سب سے افضل ذکر اسم ذات یعنی "اَشْر" و رُفْعی و اشیات یعنی "اَوَّلَہٗ اَلا اَشْر" کا ہے۔ لیکن اس ذکر کے بھی اپنے آداب و شرائط ہیں۔ اگر یہ ذکر ان آداب و شرائط

کے ساتھ ہو تو پھر اس سے سالک کو محبتِ خاطر حاصل ہوتی ہے اور اس کے دل کو ادھر ادھر کے بیکار خیالات سے نجات مل جاتی ہے اور تیز اس کے اندر عشق و محبت کی گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو سالک کو یہ چاہیے کہ ذکر کے لئے مناسب اور موافق وقت نکالے۔ ذکر کے وقت نہ تو اس کا پیٹ جڑا ہوا ہونا چاہیے اور نہ ایسا ہو کہ اُسے جوک ساری ہو اور نہ اُسے دل و براز کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔ اور نہ ذکر کے وقت وہ غصے میں ہو۔ اور نہ وہ منکر و منوم ہو۔ الغرض اس طرح کے تمام عوارض سے وہ پاک ہو۔ اور اپنے نفس کی ضرورتوں اور گرد و پیش کی مشغولیوں پر غور و فکر نہ کرے۔ اس کے بعد سالک کو چاہیے کہ وہ غفلت میں بائے غسل و وضو کرے۔ منہ کپڑے پہنے اور پوری طرح صاف و پاک ہو۔ اور پھر اپنے دل کو جوش میں لانے کے لئے ہر ممکن تدبیر کرے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ موت کا تصور کرے۔ عشق و محبت کی کہانیوں کو پڑھے یا وعظ و نصیحت کی باتیں یا دل کش نغمے سنے۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب سالک اپنے دل کو آمادہ جوش دیکھے تو اس وقت وہ درگاہِ نماز پڑھے۔ اور صیام کو نماز میں دوڑا تو بیٹھا ہوا ہے۔ ویسے ہی وہ قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھے اور زبان سے کلمہ لا الہ الا اللہ کہے۔ اور وہ اس طرح کہ "لا" تو خلق کے نیچے سے شروع کرے۔ اور "الہ" کو دماغ میں کہے اور "الا اللہ" کو اپنی پوری

توت سے اس طرح نکالے کہ اس کی ضرب بڑے زور سے دل پر لگے۔ آ
 لا الہ اللہ کے ذکر میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ آقا پر جو تپ ہے
 وہ پوری طرح کھینچی جائے اور آلا اللہ پر جو تشدد ہے اس پر پورا زور
 پڑے۔ اور نیز جب سالک زبان سے لا الہ الا اللہ کہے تو وہ اپنے دل
 سے غیر اللہ کی محض محبت نہیں بلکہ غیر اللہ کا سب سے وجود ہی خارج
 کر دے۔

ذکر کرتے وقت سالک کی حالت ایسی ہونی چاہئے، جیسے کہ ایک محبت
 زدہ شخص ہوتا ہے اور اپنے دل کا راز چھپانے کی بڑی کوشش کرتا ہے
 لیکن اس کے باوجود وہ اس راز کو چھپا نہیں سکتا۔ اب اگر سالک کے اندر
 اہم دو بے خودی کی یہ حالت از خود پیدا نہیں ہوتی تو اسے چاہیے کہ وہ
 تم سے کم اس بہت توبہ کیفیت کوشش سے اپنے اور ضرور طاری کرے
 بہ خیال ذکر کے لئے ضروری ہے کہ ذکر بہت بڑا کرنے لگے تو وہ وجد
 و بہت خودی کی کیفیت میں ڈوبا ہوا ہو۔ اور ذکر کرنے کے جب سالک
 اپنے دل میں زیادہ وجوش و گوری محسوس کرے تو ایسی کے مطابق وہ آلا
 اللہ اللہ کو اور زور سے کہے۔ اور چون چوں اس کے وجد میں حذت پیدا
 ہوتی جائے اسی حال میں وہ ذکر لا الہ الا اللہ کو زیادہ بلند اور
 سانس کر جائے۔ اور آلا اللہ کی ضربوں میں زیادہ زور پیدا کرے
 عرض کر سالک مزاج کا کامل اور عشق و محبت کی سلامت رکھ کر
 اور وہ ان آداب و خصال کے ساتھ ایک دو گھنٹی ذکر کرے گا تو تین

اُسے پورا المینا خاطر نصیب ہو جائے گا۔ اور اس کے دماغ کو پرکندہ
خیالات سے نجات مل جائے گی اور شرق و غربت کی بے قراری اور
گرمی بھی اُسے ضرور حاصل ہو جائے گی۔

جب ذکر کے دوران میں سالک میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے
تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنی پوری کیفیت کو برابر نگاہ میں رکھے اور
اُسے اپنی نظر بصیرت سے اوجھل نہ ہونے دے۔ سالک کو چاہیے کہ
وہ اس کیفیت کو ایسی طرح سے جانے لے۔ اور اس کو خوب سمجھ
لے اور جہاں تک ممکن ہو اپنی اس کیفیت کی حفاظت کرے۔ اور اگر
کبھی اُسے محسوس ہو کہ اس کی یہ کیفیت اس کے اندر مقصور ہو رہی ہے
یا کمزور پڑ رہی ہے۔ تو وہ اس کیفیت کو بڑھانے کی مزید کوشش کرے،
جو شخص کہ صبحِ افہم اور مزاج کا کامل مہنگا ہو تو ذکر کی ایک ہی مجلس میں
اس کیفیت کو سمجھ جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص طبیعت کا سخت ہو اور
پہلوؤں کے سے قوی رکھتا ہو، تو مرشد کو چاہیے کہ اُسے تین روز
رکھوئے اور دروزوں کے دوران میں اُسے کھانے کو کم دیا جائے۔
اسی طرح اگر وہ چند بار عمل کرے گا تو ایسا ہے کہ اُسے ذکر میں کیفیت
ضرور حاصل ہو جائے گی۔ اور وہ اس کیفیت کو خوب سمجھ لے گا۔
اور اُسے ابھی طرح جان بھی لے گا۔ لیکن فرض کیا اگر تائبہ کرنے کے
باوجود بھی یہ کیفیت اُسے حاصل نہ ہو تو ایسے شخص کو مسدود سمجھ کر اُسے
اور او و وظائف میں لگا دینا چاہئے۔

اس ضمن میں تین باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ جہود اہل طریقت ذکر میں سرگھرانے، قلب پر ضربیں دینے اور کلام اللہ میں تداودِ شذی رعایت کرنے پر متفق ہیں۔ ذکر میں ان چیزوں کی ضرورت اس لئے پڑی کہ اس طرح ذکر کرنے سے سالک کو غیبیتِ ظاہر حاصل ہوتی ہے اور اس کے دماغ سے پراگندہ خیالات دور ہو جاتے ہیں، اور نیز بہت دشواری کے بذاتِ اس کے دل میں بیدار ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ کے بعض پیرو یہ کہتے ہیں کہ خواجہ نقشبند نے لذت و لذت سے ذکر کرنے کی۔ لذت فرائی ہو۔ یہ چیز تو اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ خواجہ نقشبند سے پہلے اس سلسلہ کے سب بزرگ ذکر جہود اور ذکرِ خفی دونوں کرتے تھے۔ بلکہ کچھ پرچھے توان بزرگوں پر ذکرِ خفی سے زیادہ ذکر جہود غالب تھا۔ اور خاص طور پر پیر اور جمعرات کے دن تو یہ بزرگ پوری کبھی سے ذکر جہود کیا کرتے تھے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ نقشبند نے ذکر جہود کیوں مانعت فرائی، ہوس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ذکر جہود منہی مذہب میں کر وہ ہے۔ اس لئے خواجہ نقشبند نے ذکر جہود کے مقابلے میں ذکرِ خفی کو زیادہ مناسب اور بہتر سمجھا۔ اور آپ نے اسی کو اختیار کیا۔ اس کے علاوہ خواجہ نقشبند کی صحبت میں غیر معمولی تاثیر و برکت تھی۔ اس لئے انہیں ذکر جہود کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض حالات اور بعض اشخاص

میں جذب و بے خودی کی کیفیت ذکر جہر کے بغیر پیدا نہیں ہوتی یہ جاننے کے باوجود پھر بھی جو شخص ذکر جہر سے کلیتہً انکار کرتا ہے، تو یہ محض اس کی ہٹ دھرمی ہے۔

اس ضمن میں تیسری بات یہ ہے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس سلسلہ میں جس بات کا حکم دیا ہے اور مسلمانوں کی جس امر کی ترغیب دلائی ہے، وہ دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک ذکر اور دوسرے فکر۔ ذکر سے مراد ذکر زبانی ہے۔ خواہ وہ ابتداً دانے سے ہو یا غنی ہو جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔ ذکر جہر اور ذکر غنی دونوں کا تعلق زبان سے ہے لیکن جو کہ زبان کے اس ذکر سے براہ راست فکر تکسید پہنچا دیتا ہے اس کو مشائخ تصوف نے ذکر زبانی اور فکر کے درمیان ذکر قلبی کو ایک واسطہ مانا ہے۔ ذکر قلبی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک رخ تو زبان کی طرف ہوتا ہے اور اس کا دوسرا رخ واضح کی طرف۔ انقرض ذکر قلبی کی نسبت ذکر زبانی اور فکر کے درمیان ایک ہرخ کی ہے۔ رشک شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذکر زبانی اور فکر کی توضیحیں فرمائی ہیں ذکر قلبی آیت مروی نہیں ہے۔ بہر حال ذکر قلبی کا جائزہ مولانا محمد علی اشرف علیہ وسلم کی اس مشہور حدیث کی نکتہ میں آجاتا ہے جس کو امام محمد نے مؤطا امام مالک کی روایت میں نقل کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ”ما من المؤمن منّا لم یحضر عند اللہ خمسین میں چیز کو مومنوں نے اچھا سمجھا، وہ چیز اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔“

مراقبہ اور اس کے احکام

سالم کو جب وجد و شوق کی کیفیت حاصل ہو جائے تو اُسے چاہئے کہ لوگوں سے بات چیت کم کر دے اور دنیا کے کاروبار سے کنارہ کش ہو جائے اور نیز جسمانی لذتوں اور اس طرح کی دوسری باتوں کو ترک کر دے۔ اور اس طرح وجہ و شوق کی کیفیت کو اپنے اندر راسخ اور مستحکم کرے تاکہ اس کی یہ کیفیت اُس کے لئے کوئی ٹوٹکی بھی نہ رہے بلکہ یہ بالکل واضح اور نمایاں ہو جائے۔ جب سالم راہِ طریقت میں اس مقام پر پہنچ جائے تو پھر اس کو مراقبہ کرنا چاہئے۔

مراتبے سے کمالات مجموعی مراد یہ ہے کہ سالم اپنی قوت اور پاک پوری طرح اللہ تعالیٰ کی صفات کے تصور میں لگا دے۔ یا وہ نزع کی اس حالت کا دھیان کرے جب رُوح بدن کو چھوڑتی ہے۔ یا اس طرح کی کسی اور کیفیت پر سالم اپنی توجہات کو یوں مبذول کر دے

کہ اس کی عقل، اس کے دھم و خیال کی قوت اور اس کی غامضی تمام اس
 چیز کے تابع ہو جائیں اور سالک پر ایسی کیفیت جاری ہو جائے
 کہ جو چیزیں محسوسات میں سے نہیں ہیں، وہ اس کو محسوسہ نظر آئیں
 مراقبے کے معاملہ میں سب سے خوش نصیب وہ شخص ہے، جس کو
 قدرت کی طرف سے غیر معمولی چیزوں پر قویہ کرنے کی جہاں زیادہ استعداد
 و ولایت ہوئی ہو۔ چنانچہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں پر قوت
 خیال غالب ہوتی ہے، اور وہ خیال کو اپنے سامنے اس طرح ٹھکراتے
 دیکھتے ہیں کہ اس کی طرف وہ ہر ذرے اشارہ کرتے ہیں، بلکہ بعض تو زبان
 سے اس تسلسلہ میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ لوگ انہیں باطل کئے گئے ہیں۔
 مراقبے کی بہت سی قسمیں ہیں اور ان کا ذکر ہم دوسری جگہ پر آئے ہیں
 یہاں ہم اس شخص میں صرف انہیں چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جن کا علم ہم الہام کے ذریعہ
 عطا ہوا ہے۔ مراقبے میں سب سے پہلے تو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ آدمی کو اس دنیا
 سے کلیتہً فراغت حاصل ہو چکی ہو۔ اور فراغت حاصل کرنے کا طریقہ ہم
 پہلے بتا آئے ہیں۔ اس کے بعد سالک کو چاہیے کہ وہ اس خیال کو اپنا
 نصب العین بنائے اور اسی طرف اپنی پوری قویہ مبذول کر دے کہ
 حق سبحانہ اس کو، اور اس کے علاوہ تمام کی تمام چیزوں کو اپنے سے
 اوپر سے، دائیں سے بائیں سے، اور اندر سے اور باہر سے، الغرض
 ہر طرف سے ٹھکرتے ہوئے ہے۔ اور گو حق سبحانہ ہر جہت سے پاک اور
 منزہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود سالک کو چاہیے کہ وہ اس ذاتِ اقدس

کو مرتبے میں اپنے سامنے یوں دیکھے جیسا کہ فضا میں ہوا جاری و باری
نظر آتی ہے۔ یا جس طرح گارے میں پانی رواں دواں ہوتا ہے۔ غرضیکہ
ذات باری کی ہمہ گیری کو وہ چشم بصیرت کے سامنے اس طرح مشکل
کرسے کہ اس کو ہر طرف حق سبحانہ ہی کا نور جلوہ گر نظر آئے۔ اور وہ
پوری دل جمعی سے اس بات پر یقین کرے کہ کون و مکان میں نور الہی
کی یہ جلوہ گری میرے فکر و مجاہدہ کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ نور از خود بغیر
میری کسی سعی و کوشش سے جلوہ لگن ہے۔

مراتبے میں حق سبحانہ کے نور کو اس طرح جلوہ گرد دیکھنا ہی مراتبے
کا اصل مقصود ہے۔ اب یہ سالک کی اپنی استعداد پر منحصر ہے کہ وہ
اس کیفیت کو چہ ماہ میں حاصل کرنے یا تین ماہ میں یا اس کے حصول
میں اسے صرف ایک ہفتہ لگے۔ مرشد کو چاہیے کہ جب سالک حق
سبحانہ کے نور کو اس طرح محسوس طور پر دیکھنے لگے تو وہ نسبت بزرگی
کی طرف اس کی رہنمائی کرے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ مرشد
سالک کو اس امر کی تلقین کرے کہ وہ حق سبحانہ کے نور کے اس محسوس
تصور میں سے اشیاء کے وجود کو جن کو یہ نور گھیرے ہوئے ہے،
خارج کر کے اور جہات کے خیال کو ذہن سے کلیتہً نکال کے حق سبحانہ
کے نور کو اشیاء و جہات سے بالکل پاک و منزه دیکھے۔ اس
طرح اگر وہ غوثی سے کوشش کرے گا تو اس کو نسبت بزرگی حاصل
ہو جائے گی۔ الغرض نور محسوس کا تصور مراتبے کا پہلا قدم ہے اور

یہ نسبت بے رنگی کا مقام اس کا دوسرا حصہ۔

مشائخ تصوف کے ہاں بہت سے مراتب مرتب ہیں بعض مراتب
دل کو ادھر ادھر کے خیالات سے فارغ کر کے پورے اطمینان کے
ساتھ ذات واحد کی طرف متوجہ کرنے کے لئے احتیاط کئے گئے ہیں۔
اس قسم کے مراقبوں کے لئے ناک پر نظر جانے رکھنے کی مشق نبھانی
ہے، اور بعض مراتب نفس کی خواہشات کو دبائے اور اسے اس
قابل بنانے کے لئے کئے جاتے ہیں کہ وہ ذات مجرد کی طرف پوری
طرح متوجہ ہو سکے۔ اس قسم کے مراقبوں کے لئے آفتاب کو مسلسل
دیکھنے یا سار کی طرف نظر جانے کی مشق کی جاتی ہے۔ اور بعض مراقبوں
سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ نفس درجہ درجہ اپنے اندر اتنی مستعد
پیدا کرے کہ وہ تصورات کو اپنے ذہن میں متشکل دیکھ سکے۔ اس
غرض کے لئے آئینہ کا نام کاغذ پر لکھ کر اس کو برابر دیکھنے کی مشق
کی جاتی ہے۔ اسی طرح بعض اور مراتب میں جن میں ذات حق کی طرف
”توجہ“ کرنے کے طریقے میں کئے گئے ہیں، مشائخ نے اس ”توجہ“ کی
دو قسمیں کی ہیں، ایک ”توجہ بہ اسم“ کی طرف، اور دوسرے بہ
کہ سنہی کی طرف توجہ کی جائے۔ ”توجہ بہ اسم“ کی مثال نفس کی حرکت
کی سی ہے کہ اس کی رفتار مسلسل نہیں ہوتی، بلکہ آہرین پر ہوتا ہے
کی چوٹوں کی طرح اس کی حرکت الگ الگ ہوتی ہے۔ اور ”توجہ بہ معنی“
کو یوں سمجھئے کہ سالک کا خیال دُور دراز پہنائیوں کی جا کر خیرائے۔

گو یا کہ وہ ایک دھماکا ہے کہ اُسے جتنا بھی کھینچے، برابر کھینچتا چلا جاتا ہے، یا اس کی مثال ایک ایسی آواز کی ہے، جو برابر آرہی ہے اور کان قوتِ سماعت سے کام لے بغیر اس آواز کا تصور کر رہا ہے۔ مراقبے سے سالک کے اندر جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو اس وقت اُسے وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جس کو لطائف کی زبان کھل جانے کا مقام کہتے ہیں۔ یعنی دل و دماغ اور انسان کی دوسری استعدادوں کو گو یا کہ قوتِ گویائی مل جاتی ہے۔ اس ضمن میں بعض مشائخ مراقبوں میں سالک کو کسی ایک نسبت کو ملحوظِ نظر رکھنے کی تلقین کرتے ہیں مثلاً وہ اُسے "انت فوقی، انت خمتی" کا ذکر کرنے کو کہتے ہیں۔ اس سے سالک کے لئے نسبتِ توحید کی راہ نزدیک ہو جاتی ہے۔ الغرض یہ میدان بڑا وسیع ہے۔ اور ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق اور ادراک کے مطابق مختلف قسم کے مراقبے تجویز کئے ہیں۔

وہنا من فیہا عشقون مذاہباً

لیکن اس ضمن میں فقیر یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ ذکر و اذکار اور مراقبہ و مجاہدہ کے مسائل میں حق سب کا نہ ہو مطلوب یہ ہے کہ اذکار میں سے وہ ذکر کیا جائے، جس کی کہ شریعت نے اجازت دی ہے۔ اور مراقبہ ایسا ہو کہ سالک کی توجہ فوراً ذاتِ باری کی طرف مبذول ہو جائے۔ مراقبے کے سلسلہ میں یہ نہیں ہونا چاہیے

کہ ساک اس کی تہیدی مشقوں میں بچپن کر رہ جائے۔ کیونکہ اگر وہ اس حالت میں مر جائے گا تو اُسے آخرت میں حسرت اور رنج ہوگا۔ مثلاً اگر ساک مراقبے کی تہیدی مشقیں کر رہا ہو۔ یعنی وہ مسلسل آواز سننے میں مصروف ہو یا غلا کو ٹنگلی باندھ کر دیکھنے کی مشق میں لگا ہوا ہو یا وہ آفتاب کی حریت دیکھنے یا ناک پر نظر جانے کی مشق کر رہا ہو اور اس کو موت آجائے تو اندازہ لگائیے کہ آخرت میں ہے اپنی اس عرومی کا کتنا صدمہ ہوگا۔

راہِ سلوک کی روکاؤٹیں

جب ساکب ان اشغال کو کر رہا ہو تو اس سلسلہ میں اُسے چند روکاؤٹیں پیش آتی ہیں۔

(۱) ان میں سے ایک رکاوٹ ادھر اُدھر سے خیالات و وساوس کا پیدا ہونا ہے۔

خیالات و وساوس کی دو قسمیں ہیں۔ ان کی ایک قسم تو یہ ہے کہ انسانی ذہن بالارادہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو روزِ دو روٹیاں اور ایک پیالہ شہد کا شہد ہو وہ دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ اگر روٹیاں کھا لیا کروں اور شہد بچاؤں تو کچھ دنوں کے بعد میرے پاس شہد کا ایک ٹکڑا جمع ہو جائے گا۔ میں اسے بیچ کر مرغیاں خریدوں گا۔ اور جب مرغیوں کی نسل بڑھے گی تو ان سے یہ چیزیں خریدوں گا۔ غرضیکہ اس طرح اس

کے خیالات کا سلسلہ چلتا ہے۔ اسی قسم کے خیالات میں فکرِ خمر کے نئے تخیل آرائیاں اور نجوم کے ذرائعِ جانتے کے سلسلے میں ذہنی کی قیاس آرائیاں داخل ہیں۔ اور نیز معقولات کی یہ بحثیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ ہم کیوں تسلیم کریں؟ اسی قبیل میں سے ہیں۔

دب، خیالات و دساوس کی دوسری قسم یہ ہے کہ یا تو بجا قصد اور بغیر سوچے ہوئے خود بخود خیالات دماغ میں چلے آتے ہیں، یا ان کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جو چیزیں آنکھوں نے کبھی دیکھی تھیں، ان چیزوں کی صورتیں حسِ مشترک میں بھر جاتی ہیں۔

پہلی قسم کے خیالات و دساوس کا علاج یہ ہے کہ سالک اپنی بہت کے جذبے کو برا نگینہ کرے۔ اور اس کی شکل یہ ہے کہ وہ کوئی ایسی تدبیر کرے، جس سے اس کے دل میں جوش پیدا ہو۔ ان تدابیر کا ذکر ہم اس سے پہلے کر آئے ہیں۔ جب سالک میں اس طرح کی کسی تدبیر سے جوش پیدا ہوگا، تو اس کے اندر نئے سرے سے اپنے نفس کی تہذیب و اصلاح کا جذبہ ابھر اٹھے گا۔ اس حالت میں اُسے چاہیے کہ وہ خلوت اختیار کرے اور اس امر کی کوشش کرے کہ کم سے کم کچھ وقت کے لئے اپنے دل میں باہر کے خیالات نہ گھسنے دے۔ لیکن اگر اس کوشش کے باوجود ادھر ادھر کے خیالات بھر رہی پورن کر آئیں تو اُسے چاہیے کہ قبل اس کے کہ اس کا دل اور دماغ ان خیالات کی لذت محسوس کرے۔ وہ ان خیالات کو اپنے آپ سے

دور تھا دے۔ فرض کیا اگر اس کا دل ان خیالات سے نہیں بننا پاتا تو اُسے چاہیے کہ وہ اپنے دل کو سمجھائے اور اسی سے کہے کہ ابھی تو تم ان خیالات سے دور گزرو۔ تھوڑی دیر بعد پھر ان خیالات سے مظلوم ہو لینا۔ الغرض اس طرح مائل مائل کر کے وہ اپنے دل سے کچھ مدت کے لئے ان خیالات کو دور کر دے۔ اور پھر جس تدریس سے اُس نے اپنے اپنے اندر جوش اور تہذیب نفس کا جذبہ پیدا کیا تھا۔ پھر اسی تدریس کو عمل میں لائے۔ اور اپنے دل سے خیالات و وسوسوں کو دور کرنے کی سعی کرے۔

دوسری قسم کے خیالات و وسوسوں کا علاج یہ ہے کہ مذکورہ ذیل طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے ساکھ دل میں جذب و شوق پیدا کرے۔ اول وہ کسی قوی توجہ والے بزرگ کی صحبت میں بیٹھے اور اپنے دل کو ادھر ادھر کے خیالات سے خالی کر کے ایک دو گھنٹی کے لئے اُسے پوری طرح اس بزرگ کی طرح متوجہ کرھے۔ دوم یہ کہ وہ مشائخ کی پاک روجوں کی طرف توجہ کرے۔ ان پر غافل پڑھے۔ ان کی قبروں کی زیارت کرے۔ اور ان بزرگوں کی ارواح سے جذب و شوق کی توفیق چاہئے۔ اور تیسرے یہ کہ وہ خلوت میں جاتے غسل کرے۔ نئے کپڑے پہنے اور دو رکعت نماز پڑھے۔ اور پھر اَللّٰہُمَّ نَفْسِیْ مِنْ اَعْثَابِ النَّارِ اور اَللّٰہُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا کا جہاں تک اس سے ہو۔ لکے ذکر کرے۔ اور نماز کے بعد یا نوز کا چار صوفی یا سہ صوفی ذکر کرے۔ یہ سب کچھ کرنا کے بعد بھی اگر خیالات اور وسوسوں دل میں تشویش پیدا کریں، تو

ساک کو چاہیے کہ فوراً اٹھے، دوبارہ وضو کرے، پہلے کی طرح دو رکعت نماز پڑھے، اور اسی طرح پھر ذکر کرے اور اگر پھر بھی وسوسے بھیجائے چھوڑیں تو پھر پہلے کی طرح وضو کرے، نماز پڑھے اور ذکر کرے، میں اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر ساک دوتیس بار اس طرح کرے گا تو اسے ایک حد تک دل میں گھٹک، سکون اور اطمینان محسوس ہو گا۔ اس کے بعد ساک کو چاہیے کہ وہ لا الہ الا اللہ کا ذکر کرے۔ اور تحصیل شوق میں لگ جائے۔ اس فیئر کو بتایا گیا ہے کہ خیالات اور وسوسوں سے نجات پانے کا یہ حتمی اور مجرب علاج ہے۔ اور اس کا ہمیشہ ایک سا اثر ہوتا ہے۔ جذب و سلوک کی راہ کی رکاوٹوں میں سے دوسری رکاوٹ قلعہ اضطراب اور عزم و ارادہ کا ضعف بھی ہے۔ اس کی وجہ سے ساک کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ وظائف قلب میں مشغول ہوتا چاہتا ہے، لیکن اس کی طبیعت نہیں مانتی اور اس کے دل میں رہ رہ کر غم افزا جذبات برپا رہتے ہیں۔

اس فیئر کو بتایا گیا ہے کہ قلعہ اضطراب اور عزم و ارادہ کے ضعف کے سبب ذیل اسباب ہیں۔ اول مزاج کا اختلال، یعنی طبیعت پر بوداویت کا غلبہ ہو۔ اس کا علاج یہ ہے کہ قصد یا سہل کے ذریعہ طبیعت میں اعتدال پیدا کیا جائے۔ قلعہ اضطراب اور عزم و ارادہ کے ضعف کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں۔ دوم یہ کہ جسم ناپاک ہے اور ایک عرصہ سے غسل نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے بدن پر میل کھیل جاتی ہوئی

ہے۔ اس کا تدارک غسل سے کرنا چاہیے۔ اور پھر صوم اور کپڑوں کی صفائی کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ صوم گناہوں کے ارتکاب سے جس طبیعت میں قلعہ و اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ یہ گناہ غریبوں پر مسلم کرنے کی فصل میں ہوں یا دوسروں کے حقوق بچھنے کی صورت میں۔ ان کا علاج یہ ہے کہ سالک ان معاصی سے بچے۔ چارم شیا طین اور جادو کا اثر بھی طبیعت کو پرانکندہ کر دیتا ہے۔ اس کا علاج ”یا اضر“ کا ذکر ہے۔ سالک زیادہ سے زیادہ جتنا کر سکتا ہے کرے۔

طبیعت میں قلعہ و اضطراب اور عزم و ارادے میں ضعف کے پیدا ہونے کا پانچواں سبب مشائخ طریقت کی شان میں بے ادبی کا ارتکاب ہے۔ اس کا تدارک اس طرح ہو سکتا ہے کہ آدمی اسکے ارتکاب سے باز رہے۔ ششہم بات یہ ہے کہ دل میں دنیا کی محبت کی رگیں پوشیدہ ہیں۔ اور گو وہ برا طور پر نظر نہیں آتیں۔ لیکن جب کبھی بھی ان کو موقع ملتا ہے تو وہ اُجر کر اپنے تاریک اخوات دل پر ڈالتی ہیں۔ چنانچہ اس سے طبیعت میں قلعہ و اضطراب اور عزم و ارادہ میں ضعف پیدا ہوتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ سالک مستقل طور پر جس طرح کہ ہم پہلے لکھائے ہیں، ذکر کرے۔ اور اس کی کوشش یہ ہو کہ جن اطراف و جہات سے دنیا کی محبت اُس کے دل پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ وہ اُن اطراف و جہات کی نشانی کرے۔ منعم راہ سلوک میں سالک کو طرح طرح کی جو مشقتیں کرنی پڑتی ہیں۔ کبھی ان کے خیال سے اُس کا دل ڈر جاتا ہے۔ اس کا

علاج یہ ہے کہ سالک شائع کی حکایات سُنے۔ اور اپنے دل کو اس اور اُمید سے منقطع نہ ہونے دے۔ ان فرضِ الٰہی تمام امراض میں سالک کو چاہیے کہ پہلے تو وہ اپنے دل کے اہل عارضے کا پتہ لگائے، اور پھر اس عارضہ کا مسلح کرے۔ لیکن اگر سالک اپنے اس عارضے کی سمجھ و فہم نہ کر سکے تو مرشد کو چاہیے کہ وہ سالک پر نگاہ رکھے۔ اور مختلف مجالس میں اُس کی حرکات و سکنات کو بڑے غور و محنت سے دیکھتا رہے۔ اور اس کی باتوں اور اس کے آثار و قرائن یا خدا تعالیٰ نے مرشد کو جو فراست عطا فرمائی ہے اس کی مدد سے وہ سالک کے عوارض کا کھوج لگا کر اور پھر اُن کا تدارک کرے۔

(ج) اس سلسلہ میں اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ سالک کو خواب میں یا بیداری میں طبعِ طبع کے واقعات اور احوال پیش آتے ہیں۔ نیز ذکر و اذکار میں دُکور دُکور کے خیالات اس کے دماغ میں آنے لگتے ہیں۔ مزید برآں وہ اپنے سامنے انوار کو روشن اور درخشاں دیکھنے لگتا ہے۔ ان فرض جب سالک کو اس قسم کے معاملات پیش آتے ہیں، تو وہ انہیں بڑی عظمت و شان کی چیزیں سمجھتا ہے، اور اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اُس کے ہاتھ میں بڑی متاعِ آسمانی چنانچہ اس کی دہرے سلوک کا جو اصل مقصود ہے۔ اس کے لئے وہ جدوجہد کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ سالک کو چاہیے کہ جب وہ ان حالات میں سے گزر رہا ہو تو اپنے اوپر ضبط رکھے۔ اس سلسلہ میں فقیر کو بتایا گیا ہے کہ ان حالات میں سالک پر انکار

و تصورات کی جو بھی شکلیں رونما ہوتی ہیں۔ اُن کی یہ صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا
تو سالک کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ حق تعالیٰ کی
تخلی ہے۔ یا وہ اس تخلی کی طرف متوجہ ہے۔ اگر سالک کو اس بات پر
یقین ہو تو واقعی وہ تخلی تخلی حق ہوگی۔ اور اگر سالک اس حالت میں اس
تخلی کو لگا کر باشائخ کی پاک روحوں کا نتیجہ سمجھتا ہے تو یہ تخلی اسی نوع میں
شمار ہوگی، ان تجلیات کی دوسری پہچان یہ ہے کہ اگر ان سے سالک کو
اُس سرور اور انشراح قلب حاصل ہو تو یہ تخلی لگا کر کی سمجھی جائے
گی اور اگر اس سے سالک کو وحشت اور انقباض ہو تو یہ خیالین کے
دوسرے ہوں گے۔ اور اگر اس سے نہ سرور حاصل ہو، اور نہ سالک کو
کوئی خاص وحشت و انقباض ہو تو اس قسم کی تجلیات کو طبیعت کا ایک
خیالی اُبھار سمجھنا چاہیے۔ سالک اپنے دوسرے احوال اور کوائف کو
بھی ان صورتوں پر قیاس کر سکتا ہے۔

بعض مشائخ نے جہات کے لحاظ سے بھی ملکی تجلیات اور شیطانی
دوسروں میں فرق کرنے کی کوشش کی ہے، یعنی اگر فلاں جہت سے انکار
و تصورات رونما ہوں تو انہیں ملکی تجلیات سمجھا جائے۔ اور اگر دوسری
جہت سے کوئی چیز نازل ہو تو اُسے شیطان کے دوسروں اور اخراجات
کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ فقیر کے نزدیک جہات کے لحاظ سے تجلیات کی
یہ تقسیم ٹھیک نہیں۔

توحیدِ افعالی۔ توحیدِ صفاتی۔ توحیدِ ذاتی

راہِ حقیقت کے ان مراحل کو طے کرنے کے بعد جب ”بے نشانی“ یا ”بے رنگی“ کی حقیقت کو سالک ایک مد تک پاسے تو اس کے سامنے دو راہیں کھلتی ہیں۔ ایک ”جذب“ کی راہ اور دوسری ”سلوک“ کی راہ۔ اس مقام پر مرشد کو اختیار ہے کہ اگر مناسب سمجھے تو سالک کو ”جذب“ کے راستے پر چلائے۔ اور اگر چاہے تو اُسے ”سلوک“ کے راستے پر ڈال دے۔ اس میں شک نہیں کہ تمام اکابرِ مشائخ کے نزدیک صاحبِ جذب کو ”صاحبِ سلوک“ پر ترجیح حاصل ہے۔ لیکن اس کے یہی معنی نہیں کہ ہر راہِ نور و حقیقت کو بلا استثنا ”سلوک“ کی ہی ”جذب“ کی راہ پر چلا جائے۔ بعض سالک ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعت کو راہِ سلوک سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے۔ اسلئے ان کے لئے تو سلوک ہی کی راہ قابلِ ترجیح ہوگی۔ لیکن بعض سالک ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی فطری استعداد ”جذب“ کا تقاضا کرتی ہے۔ چنانچہ ان کے لئے ”جذب“ کا راستہ اچھا رہتا ہے۔

”تذبذب“ سے یہاں وہ کیفیت مراد نہیں جس میں کہ سالک کا دل عالم غیب کی طرف یکسر متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کے دماغ سے ادھر ادھر کے خیالات باطل نکل جاتے ہیں۔ اس کی عقل اپنا کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور وہ شریعت کے احکام اور معاشرت کے آداب سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ یہاں ”تذبذب“ سے مراد وہ حالت ہے، جس میں کہ وجود کے تعینات کے یہ پردے جن کا کہ سلسلہ اس کائنات سے لے کر ذات باری تک جو حقیقتہً اکتفا کرتی ہے، پھیلا ہوا ہے۔ سالک کی نظر و کے سامنے سر ہٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ”تذبذب“ ہی کی تخیل انسانی ”انا“ میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس مقام اصل کی طرف لوٹ جاتا ہے، جو اس ”انا“ کا مبداء اول ہے، اور جہاں سے اس ”انا“ کا صدور ہوا ہے۔ غرضیکہ ”تذبذب“ سے سالک کی نظروں میں اجزائے وجود تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے سامنے سے تعینات وجود کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ باقی رہا ”سلوک“۔ سو اس سے مراد خضوع، طہارت اور عشق وغیرہ کی نفسی کیفیات میں سالک کا اپنے آپ کو رنگست یا ان کیفیات کو

لفظ ”انا“ جو فرد انسانی میں شعور ذات کا مظہر ہے، یہ انسانی ”انا“ نفس علیہ سے صادر ہوتا ہے، جو نفس علیہ کی مثال یوں سمجھئے جیسا کہ فرد کا ایک انسانی ”انا“ ہے، اسی طرح نفس علیہ کی کائنات کا ”انا“ ہے۔ نفس علیہ سے اوپر اس کے الہی کے وارث ہیں ملوئان کے اوپر ذاتِ بہت کا وجود ہے۔ ”انا“ کو نیچے کو اوپر اپنے اصل مقصود کی طرف واپس لے جانا اس ”تذبذب“ کا مقصود ہے۔ مترجم

اپنے اند پیدا کرتا ہے۔

”مہذب“ کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ سالک جب اجمالی طور پر عالم غیب سے آشنا ہو جائے تو مرشد کو چاہیے کہ اس سے زبانی یا لکھی ذکر کثرت کروائے۔ اور اس دوران میں سالک اپنی چشم بصیرت کو عالم غیب کی طرف برابر لگائے رکھے، اور وہ اپنے دل کو غمی پوری طرح اُدھر متوجہ کر دے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر سالک چند روز عالم غیب کی طرف اس طرح توجہ کرے گا تو یقیناً اس پر توحیدِ افعالی کی حقیقت مشکف ہو جائے گی۔ اور وہ محض فکر یا خیال سے توحیدِ افعالی کی حقیقت کا ادراک نہیں کرے گا۔ بلکہ اس پر یہ حالت طاری ہو جائے گی کہ وہ کل عالم اور اس کی تمام حرکت اور لوگوں کو ایک شخص واحد کی تدبیر کا افراد ایک ذات کے فعل کا نتیجہ سمجھے گا۔ اور اس کو عالم کی تمام حرکات و سکنات یوں نظر آئیں گی جیسے کہ پتلیوں کا تماشہ ہوتا ہے کہ بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ پتلیاں از خود چل پھر رہی ہیں۔ لیکن اصل میں اس کے پیچھے ہتلی والا ہتھیا ہوتا ہے، جو تار سے سب پتلیوں کو حرکت دیتا ہے۔ اگر سالک پہلے ہی سے توحیدِ افعالی کا معتقد ہے تو اس شخص سے اس پر فوراً ہی توحیدِ افعالی کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں، مثلاً اس میں توکل کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور غور و فکر، معاملاتِ اشد کے حوالے کر دیتا ہے، نیز وہ موت، زندگی، شفا، اور مرض کو ان کے جو اسباب و عوامل میں، ان میں منحصر نہیں سمجھتا، بلکہ کل میں خداوند کا قائل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس توکل کے یہ معنی نہیں کہ وہ

اسباب و نتائج کے سلسلہ کو ہی بالائے طاقت رکھ دے۔ اسباب و نتائج کا سلسلہ تو اشتر کی سنت ہے۔ اور اس پر کاربند ہونا شریعت کی طرف سے فرض ہے۔ اگر سالک پہلے سے توحیدِ فعالی کا مستفاد ہو تو جذبہ سے توحیدِ فعالی کا عقیدہ وجدانی طور پر اس کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

”توحیدِ فعالی کے ضمن میں عالم کے خدا، افعال اور اعمال کو تدریجاً خدا کی طرف منسوب کرنے میں اگر اس بات کا خیال رہے کہ سالک عمومی افعال اور اہل حوادث جیسے کہ فقر، غنا، شفا، مرض، موت، زندگی، عزت اور ذلت وغیرہ میں، ان کو وہ اشتر کی طرف منسوب کرے تو یہ مناسب اور عمدہ طریقہ ہے۔ باقی راہ پر کہ درختوں کے پتوں کے، ایک ایک ذرے میں اور اس طرح کے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں تصرف و تعمیر کا جو عمل جاری ہے۔ اس کو بھی اس ضمن میں دیکھنا ہمارے نزدیک توحیدِ فعالی کے اصل مقصد میں داخل نہیں اگرچہ سالک اپنی راہِ طریقت کو اکثر ان امور سے سابقہ پڑتا ہے۔ مثلاً اس منزل میں سالک کو کبھی ذکر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اسے اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ وہ ذکر میں ”لا فاعل فی الوجود الا اشتر“ یعنی کائنات میں خدا کے سوا اور کوئی مؤثر و فاعل ذات نہیں ہے کو ملحوظ نظر رکھے۔ اس سے دراصل ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سالک کو توحیدِ فعالی کی کیفیت جلد سے جلد حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ ذکر و اذکار میں محض اس خیال کو ملحوظ نظر رکھنے کو کہ وجود کائنات میں اشتر کے سوا اور کوئی ذات مؤثر و فاعل نہیں، سالک

کو توحید افعالی کی نسبت حاصل نہیں ہو جاتی ۔

بہر حال ہر شخص کو توحید افعالی کی نسبت حاصل ہو جائے وہ ناموس یعنی عالم مادیات کو اپنے سامنے یوں پاتا ہے ، جیسے کہ وہ عالم غیب کا سایہ اور ظل ہے ۔ اب ایک عقل مند آدمی کی مثال لیجئے ۔ اگر وہ سایے کو حرکت کرتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ بلا کسی شک و شبہ کے براہِ راست پر یقین کر لیتا ہے کہ کوئی جسم موجود ہے ، جس کا کہ میں سایہ دیکھ رہا ہوں ۔ بعینہی ہی کیفیت اس شخص کی ہوتی ہے ، جسے توحید افعالی کی نسبت حاصل ہو ۔ یہ شخص جب اس دنیا میں جس کو کہ وہ عالم غیب کا سایہ اور ظل سمجھتا ہے ، اعمال و افعال ہوتے دیکھتا ہے ۔ تو یقیناً اُسے وہ تدبیرِ خفی نظر آ جاتی ہے ، جو ان سب اعمال و افعال کے پیچھے کام کر رہی ہے ۔

توحید افعالی اس راہ کا پہلا قدم ہے ۔ اس کے بعد توحید صفاتی کا مرتبہ آتا ہے ۔ توحید صفاتی سے مراد یہ ہے کہ ساکب مختلف صورتوں اور مظاہر میں صرف ایک اصل کو جلوہ گر دیکھے ۔ اور بغیر کسی شک و شبہ کے اس بات کو براہِ راست مان لے کہ سائے کے سائے اختلافات ایک ہی اصل میں ثابت اور موجود ہیں اور پھر وہ اس اصل کو نوع بنوع صورتوں میں جلوہ گر بھی دیکھے ۔ اور ہر جگہ اس اصل کو پہچانے ۔ اس کی مثال یوں لیجئے جیسے کہ کوئی شخص نوع انسان کے تمام افراد میں ایک انسان کلی کا مشاہدہ کرتا ہے ۔ یا وہ موسم کی مختلف صورتوں میں ایک ہی موسم کی خبر کو ہر صورت میں موجود پاتا ہے ۔ انفرنس یہ ایک اصل جو وجود

کے ہر منظر میں اور کائنات کی ہر شکل میں مشترک ہے۔ سالک کو چاہیے کہ وہ اس اصل کو ہر چیز میں بے رنگ دیکھے۔ اور کسی منظر کے مخصوص رنگ کو اس میں موخر نہ مانتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سالک کو اس حقیقت سے بھی بخبر نہ رہنا چاہیے کہ اس اصل کی یہ بے رنگی۔ اور بعد میں اس نے مختلف مظاہر میں جو الگ الگ صورتیں اور گونا گوں رنگ اختیار کئے ہیں، ان دونوں حالتوں میں کوئی تضاد نہیں اور اصل کی یہ بے رنگی اس امر میں مانع نہیں کہ یہی اصل مختلف صورتوں اور مختلف رنگوں میں ظہور پذیر نہ ہو۔ لیکن سالک کو ایک اصل کی یہ بے رنگی اور بے رنگی محض غور و فکر کے ذریعہ نہیں بلکہ وجدانی طور پر اور براہ راست مشاہدہ کرنی چاہیے۔

پہر حال ایک ہی اصل کو وجود کے ہر منظر میں دیکھنا یا غور و فکر کے ذریعہ ہوتا ہے یا وجدانی طور پر اور براہ راست۔ اور مشاہدہ و قرآن کے یہ دونوں مقام باہم ملے جلتے ہیں۔ جہاں ایک ختم ہوتا ہے۔ وہیں سے دوسرے مقام کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس راہ میں بعض سالک ذیل سے بھی ہوتے ہیں کہ وہ ساری عمر مشاہدہ فکری کے مقام میں رہتے ہیں اور اس سے آگے نہیں ان کو ترقی نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن جو سالک فی حقیقت اور ذکی الذہن ہو، وہ ان حالات کے بعد پوری طرح اس ایک اصل کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور ان مختلف صورتوں اور اشکال کی طرف مطلق انکسار نہیں کرتا وہ وجود کی کثرت اور مظاہر کی بے غلغلی سے اپنی نظر اس طرح پھیر دیتا ہے، گویا وہ انھیں بالکل بھول ہی گیا۔

خدا تانے کی طرف سے انسانوں کے لئے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ اپنے "انا" میں جو عبارت ہے ان کی "ہویت" سے توحید صفاتی کا جلوہ دیکھیں۔ لیکن ان کے لئے یہ "انا" آئینہ بنتا ہے اس اصل وجود کا، جس نے مختلف مظاہر کائنات میں ظہور فرمایا ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جب سالک اپنے "انا" پر نظر کرتا ہے تو اس کی نظر اپنے "انا" تک رُک نہیں جاتی بلکہ وہ اس "انا" کے واسطے سے اصل وجود تک جو سب "اناؤں" کا مبدأ اول ہے پہنچ جاتی ہے۔ اور جب سالک اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کی نظر میں صرف اصل وجود ہی رہ جاتا ہے۔ اور یہ تمام کے تمام مظاہر و اشکالیٰ بیچ سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ توحید ذاتی کا مقام ہے لیکن جہاں نہیں، ذہنی ذوق کے ضمن میں توحید ذاتی کا نام آتا ہے تو اس سے مراد ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے جو انہیک لینے والی بجلی کی طرح چمکنی ہے اور چرچہ ختم زون میں غائب ہو جاتی ہے۔ بہر حال جہاں ہمیں توحید ذاتی کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ سلوک کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ جہاں کہ سالک اگر قرار پذیر ہوتا ہے۔

عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ سالک پہلے توحید افعالی کی نسبت حاصل کرتا ہے، پھر اس سے توحید صفاتی کے مقام پر پہنچتا ہے۔ اور وہاں سے وہ توحید ذاتی کا مرتبہ حاصل کرتا ہے۔ لیکن بعض سالک توحید افعالی سے براہ راست ایک جست میں توحید ذاتی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور انہیں اس راہ میں توحید صفاتی سے گزرنے کی ضرورت نہیں پڑتا لیکن یہ چیز بہت کم

ساکوں کے حصے میں آتی ہے۔ قصہ مختصر جب ساک توہید ذاتی کی نسبت حاصل کر لیا ہے تو بعد وہ بلا تاخیر بے ثنائی یا دو اشیاء اور ذکر غیب کی نسبت کو پہنچ جاتا ہے۔ اس نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ ساک حقیقتاً افعال یعنی ذاتِ باری کی طرف کلیتہً مشغول ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب ساک اس مقام پر پہنچ جائے تو اسے چاہیے کہ کچھ مدت اس مقام میں ٹھہرے۔ اور اپنے آپ کو ہر خیال اور ہر جہت سے بے پروا کر کے پوری محبت سے زیادہ سے زیادہ کھل اور وسیع کرے اور نسبت بے ثنائی کی اصل حقیقت کی طرف اس طرح متوجہ ہو کہ اس پر یہ بات مشکف ہو جائے کہ یہی ایک حقیقت ہے جس سے ایک خاص تئیں نے صادر ہو کر ساک کی "حویت" یعنی اس کے "انا پرزوں" کیا اور بزر اس کے "انا پر حقیقتِ ازل" کے اس تئیں خاص کے نزول ہی کا نتیجہ ہے کہ اسے بقا حاصل ہوتی ہے۔ یہ مقام "راہِ جذب" کی آخری منزل ہے۔ اس ضمن میں جذبات کا بابتنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ جب ساک ہر اس قسم کی وحدت مشکف ہو جائے تو اسے یہ تئیں کر لیا جائے کہ اس کی "جذب" کی راہ طے ہو چکی۔ خواہ وہ اس مرحلہ پر توحید وجودی کا مستعد ہو یا نہ ہو۔ اس احوال کی تفصیل یہ ہے کہ ساک توحید افعالی سے توحید صفاتی حاصل کرتا ہے۔ اور اس منزل سے جب وہ آگے بڑھتا ہے، تو توحید ذاتی میں پہنچتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر وہ اس معاملے کی توجہ یوں کرتا ہے کہ پہلے میں مغلوبیت کی حالت میں تھا اور

میں نے ذاتِ واجب کو جو ہر شے کی قیوم ہے، "ممکن" کے ساتھ انھا کی نسبت دے دی تھی۔ بالکل اسی طرح میں طرح کو کوئی شخص خواب میں دزدے کو دیکھتا ہے اور وہاں دزدے کا کوئی وجہ و نہیں ہوتا وہ خواب دیکھنے والے کی اپنی غلطی قوت ہوتی ہے۔ جو اسے دزدے کی شکل میں نظر آتی ہے۔ ساکب جب اس مقام سے ترقی کرتا ہے تو بھرہ حقیقت اُس کے لئے بالکل منزہ ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت وہ نمونہ جاتا ہے کہ "تشبیہ کے مقام سے وہ تنزیہ" کے مقام میں پہنچ گیا، اور تشبیہ سے اس نے خلاصی حاصل کر لی۔ اب ایک اور ساکب ہے، اور اس کو بھی یہی کیفیت پیش آتی ہے، وہ اس کی توجہ اس طرح کرتا ہے کہ یہ ایک مسئلہ حقیقت ہے کہ کائنات کے ہر فرد میں ذاتِ باری کا جلوہ باری و ساری ہے۔ اب جو میں نے ذاتِ واجب کو "ممکن" کے ساتھ بصورت اتحاد دیکھا تو یہ ایک پردہ ہوا دوسرے پردہ کا جس کو فقط سیری نظر دیکھتی ہے، ورنہ جہاں تک اہل کائنات ہے۔ وہ اسی سب تشبیہات سے منزہ ہے۔

ان نکات میں دوسرا نکتہ یہ ہو کہ یہ راہ سب کے نزدیک مسلم ہے اور اولیائے کاملین سے ہر ایک کو اس راہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور ان مقامات کی تعبیر میں ان میں آپس میں اختلاف ہے

عباسی متناشتی و حسنات واحد
کلّ الی ذات الجمال لیشیر

لیکن قوی معرفت اور ذکی الذہن آدمی اگر چاہے تو ان ادبیات کے کلام کا حاصل مطلب سمجھ سکتا ہے۔ انسان کی تعبیرات میں جو اختلاف ہر وہ ان سب کو ایک اصل کی طرف مرکوز بھی کر سکتا ہے۔ مزید برآں ادبیات میں آپس میں بعض تعبیرات کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ اس راہ کو طے کرنے کے معاملات میں بھی ان میں اختلاف ہوتا ہے۔ بعض ایک مقام پر تعویذی ویرہے کہتے ہیں، اور بعض کو زیادہ ویرہاں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح جیسے جیسے ان کی استعداد ہوتی ہے، انہی کے مطابق ان کو مختلف احوال اور واقعات بھی پیش آتے ہیں۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اس فقیر کو بتایا گیا ہے کہ مشریت میں سلوک کی راہ کی تو وضاحت کی گئی ہے، لیکن راہِ مہذب کو بیان نہیں کیا گیا۔ جس طرح کہ مشریت میں اسم اعظم اور لیلۃ القدر کی تصریح نہیں کی گئی۔ لیکن اس کے باوجود جو لوگ شارح علیہ السلام کے اقوال کو راہِ مہذب پر محمول کہتے ہیں تو ان کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی علم انہو کی شہود کتاب کا فیہ ابنِ مہذب سے تصوف کے قوانین اخذ کرے۔ باقی راہِ مہذب سلوک کا معاملہ، سو اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ سالک ایسے ملکات میں سے کوئی ملک اپنے اندر اس طرح پیدا کرے کہ وہ ملک اس کی روح کو پوری طرح احاطہ کرے۔ اور سالک اس کے رنگ میں اس طرح رنگا جائے کہ اس کا جینا ہو تو اسی حال میں، اور وہ مرے تو اسی حال میں جو سرد و جلا میرد جو خیز و مبتلا خیزو

اس راہ میں جو کیفیت اور حالت سالک کے نفس میں اس طرح جاگزیں ہو جاتی ہے گویا کہ وہ اس کی ذات کے لئے لازمی خصوصیت بن گئی اُسے نسبت دیتے ہیں۔ اس حالت سے اولیاء کے بہت سے سالک ہیں۔ اس سلسلہ میں نقیض نے باطنی طور پر عالم ارواح کی طرف توجہ کی۔ اور تصوف کے ہر طریقہ کی جبراً جہد نسبت کا ادراک کیا۔ اور نیز یہ نسبتیں یکے کے ہوں یا میں نے یہ چیز میری بذریعہ الہام معلوم کی۔ چنانچہ آئندہ صفحات میں میں اس ضمن میں کچھ لکھتا ہوں۔

نسبتوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم راہ جذب سے زیادہ مشابہ ہے گویا کہ وہ غل ہے جذب کا اور دوسری قسم راہ وظیفہ و اور اسے زیادہ قریب ہے، گویا کہ وہ اس کا حاصل اور خلاصہ ہے بعض سلف نے نسبت کی اس قسم کو "نسبت علیہ" کا بھی نام دیا ہے۔

اس دوسری قسم میں سے ایک انوارِ طہارت کی نسبت ہے۔ اس کی نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص غسل کرتا ہے اور اپنے بدن سے ناپاکی دور کرتا ہے۔ اور وضو کر کے سات کپڑے پہنتا اور خوشبو لگا تا ہے، تو اُسے اپنے اندر ایک خاص قسم کا سرور اور امن محسوس ہوتا ہے۔ یہ سرور و امن کا احساس اس شخص کے طبی قوی کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ یہ اثر اور پر تو ہوتا ہے۔ نفس کی۔ مکی قوت کا۔ جب یہ شخص بار بار اس کیفیت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ تو اس شخص کا نفس اس کیفیت کو بطور ایک فکر کے اپنا لیتا ہے۔ اور یہ کیفیت اس کے لئے ایک مستقل

خصوصیت بن جاتی ہے۔ عارف اس کیفیت کو پہچانتا اور اس سے لذت اندوز ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے برعکس جب وہ ناپاک ہوتا ہے، یا اس کا بدن اور اس کے کپڑے نجس ہوتے ہیں، تو اس کی وجہ سے اس شخص کو انقباض اور وحشت ہوتی ہے اور اس کے دل میں غم اور غم دارادہ میں انتشار و براگندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے داغ میں طرح طرح کے تشویشناک خیالات اُٹھتے ہیں۔ لیکن جو نبی وہ اعمال طہارت بجالاتا ہے تو خوراک ہی اس پر دہی سرور دامن کی کیفیت طہاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے اندر چٹے کا سا سکون و اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اگر غرض جب یہ شخص طہارت کا حاصل سرور دامن کی شکل میں اور ناپاکی کا اثر رنج و وحشت کہہ سکتا ہے، جان لینا ہے۔ اور وہ ایک سے لذت پاتا ہے اور دوسری چیز سے اُسے اذیت ہوتی ہے تو طبیعتاً اس کا میلان اس طرف ہوگا کہ وہ طہارت کا زیادہ کو زیادہ مہتمام کرے اور طہارت سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس کو زیادہ سے زیادہ اپنے پیش نظر رکھے۔ اور وضو اور غسل پر ہمیشہ کاربند رہے۔

جب سالک اپنے اندر طہارت کا یہ ملک پیدا کرے تو اس کے کمر سامنے حقیقت ملائکہ اور اُن کے اُکس و سرور کی طرف ایک وسیع راہ کھلتی ہے اور وہ ہر طرف، تشنگان اور راحت کا ایک دریائے بلیاں مشاہدہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس شخص پر ملائکہ کی طرح الہام ہوتا ہے اور نیز اس کے لئے ملائکہ کو بذریعہ الہام ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ تدریجاً الہی کے مطابق اس کی بہبودی میں کوشاں ہوں۔ اور مرنے کے بعد جب یہ شخص آقا فرست

میں پہنچتا ہے تو وہاں اس کا شمار لاکھ میں سے ہوتا ہے اور وہ انہی میں کا ایک ہو جاتا ہے۔

نسبتِ طہارت کے حصول اور دل میں اس نسبت کے جاگزیں ہونے کی علامت یہ ہے کہ سالک پر ملکی واقعات بڑی کثرت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے سامنے انوار کو روغنِ پاتا ہے اور اپنے دل اور منہ میں سورج اور چاند کو داخل ہوتے دیکھتا ہے اور نیز وہ خود اپنے آپ کو بتورا و رشفات جو اہر کی طرح پاتا ہے ہنر پر آں اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ لذیذ کھانے کھا رہا ہے۔ اور وہ دھمکی اور اس قسم کی اور طیف چیزیں اُسے میسر ہیں۔ اور وہ ریشی کپڑوں میں طہوس باغات میں زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن اس حالت میں ضروری ہے کہ اُسے اپنے دل میں اطمینان، خوشی اور تازگی بھی محسوس ہو۔ اور اس موطن میں اس کی مثال ایسی مویسے کہ بیداری میں بھوکے کو کھانا مل جائے تو اُسے بڑا آرام ملتا ہے۔

ان نسبتوں کے ضمن میں یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہی کہ اکثر یہ نسبتیں ایک دوسرے کو لازم و ملزوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے نسبتِ عشق حاصل کی۔ اور جب یہ شخص اسی نسبت کی نئی اہل تکمیل کر لیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کے اندر طہارت کی نسبت بھی خود بخود بیدار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب وہ اپنے اندر نسبتِ طہارت کے آثار پاتا ہے تو چونکہ اس کے حصوں میں اس نے کوئی رَشَفَش نہیں کی

اس نے وہ اس کو محض عنایتِ الہی کی ذریعہ سمجھتا ہے۔ اسی طرح نسبتِ
 طہارت والا جب کانگہ سے پوری مناسبت پیدا کر لیتا ہے۔ اور
 اپنے نفس کو بھی پاکیزہ بنا لیتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے دل
 پر اس کیفیت کے ساتھ ساتھ عشق و محبت کا بھی رنگ چڑھ جاتا ہے
 بنا چہ اس سے نسبتِ عشق کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اس حالت
 میں وہ نسبتِ طہارت کے علاوہ اپنے اندر نسبتِ عشق کو اس طرح
 موجود پا کر سمجھتا ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کی مزید عنایت ہے کہ مجھے خود بخود
 نسبتِ عشق حاصل ہو گئی۔ اسی طرح دوسری نسبتوں کو بھی قیاس کر کے انہیں جن نسبتوں
 کو سالک اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کرتا ہے انہیں تو وہ کسی نسبتیں سمجھتا ہے اور جن
 نسبتوں کے آثار ضمنی طور پر دوسری نسبتوں کے ساتھ ظاہر ہو جاتے ہیں انہیں وہ عین الہی
 قرار دیتا ہے۔ کل خراب یا بد چیزیں جن میں جماعت اپنی پونجی اور متاع پر نازاں ہوتی ہے۔
 نسبتِ طہارت کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ سالک خلوت میں جا
 پھر غسل کرے۔ نئے کپڑے پہنے اور دو رکعت نماز پڑھے۔ اور عیناً کہ
 ہم دل سے خیالات اور وسوسوں کو دور کرنے کے ضمن میں کھڑے ہیں۔
 وہ یا نور کا ذکر کثرت سے کرے۔ اور اسی طرح وہ بار بار غسل اور بار
 بار وضو کرے۔ اور بار بار "اے پیغمبر" اور ذکر کرے۔ اور پوری توجہ اور
 محنت سے سوچے کہ اس کی حالت چلتی کیسی ہے یا اس میں کچھ فرق آیا
 ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر وہ دو تین کھڑی تک بھی عمل کرے گا تو
 اسے نسبتِ طہارت حاصل ہو جائیگی جب نسبتِ طہارت اسے حاصل

ہو تاکہ قواسم پہلے ہی کہ وہ اس نسبت کی حفاظت کرے، اور جن چیزوں سے اس نسبت میں غفل واقع ہوتا ہے، اُن سے احتراز کرے۔ اس سلسلہ میں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقتِ طہارت صرف وضو غسل ہی پر منحصر نہیں، بلکہ وضو غسل کے علاوہ بہت سی اور چیزیں بھی ہیں، جو ان کے حکم میں داخل ہیں، جیسے صدقہ دینا، خرفشوں اور ہڑنگوں کو یگی سے یا دکر نامہ کا کام جن میں عام لوگوں کا فائدہ ہو، اور اس کی وجہ سے وہ لوگ دھماکے خیر کریں۔ اور ان کے دل خوش ہوں، وہ کام سہرا انجام دینا، ڈاڑھی مونچھ اور دوسرے بالوں کی ایسی وضع بنانا جو حالت میں مستحسن سمجھی جاتی ہے، اور انھیں بے ترتیب اور پرگانہ نہ رہنے دینا، مقدس مقامات، مساجد اور سلع کے آثار و مزارات میں احتکاف کرنا، پاک اور سفید لباس پہننا، خوشبو استعمال کرنا، طہارت کی حالت میں سونا، اور سوتے وقت ذکر کرنا، ادھر ادھر کے پریشان کن خیالات سے اپنے آپ کو بچانا، بدن سے موزی ماووں اور تاریک قندیلوں کو خارج کرنا، نفس کو خوشگوار ہوا اور خوشبو سے راحت پہنچانا نیز ایسی چیزوں کا کھانا جو صانعِ قدایت پیدا کریں تاکہ بریشانی اور صبر پر بیتہ دور رہ سکے، غرضیکہ یہ سب کی سب چیزیں طہارت کی کیفیت پیدا کرتی ہیں، یا اُن سے اس کو تقویت ملتی ہے۔

اپندرمہ شبھانی و قنعوں کا اختیار کرنا، قنص باتیں کہنا، سلف سادہ میں طعن کرنا، بے حیائی کا ارتکاب، حیوانوں کو جھٹی کرتے دیکھنا، خوبصورت

عورتوں یا بے ریش لڑکوں سے صحبت اختیار کرنا، اور اپنے فکر کو ان کے محاسن میں لٹکائے رکھنا، زیادہ عرصہ تک جماع کے خیالات کو دل میں مضمر رکھنا، اور خبثی کہ طبعی ضرورت ہے، اس سے زیادہ جماع میں مشغول ہونا، کنوں اور بندروں کو اپنے ارد گرد رکھنا یہ سب کے سب مفاسد اور نیران کے علاوہ جلدی اور دھوی امراض میں مبتلا ہونا، الغرض یہ چیزیں ان اوصاف کو پیدا کرتی ہیں، جو طہارت کی ضد ہیں، اس ضمن میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ جماع کی دو قسمیں ہیں، ایک جماع جو برائے دفعِ لذت ہوتا ہے اور جماع کی دوسری قسم وہ ہے جس سے مقصود حصولِ لذت ہوتا ہے، اول الذکر کا شمار باب طہارت میں ہے، اور آخر الذکر باب نجاست میں شامل ہے۔

یہ سب چیزیں جن کا ذکر ہم اوپر کرتے ہیں، ان میں سے بعض کو تو شریعت نے صراحتاً طہارت اور نجاست کے فہم میں بیان کر دیا ہے، اور بعض کی طرف صرف اشارہ کر دیا ہے، بہر حال چہے ان سب باتوں کا علم بذریعہ وجدان ہوا ہے، باقی الشرا عظم بالصواب

نسبت سکینہ

ان نسبتوں میں سے ایک "نسبت سکینہ" ہے۔ ہم نے اسے کہیں نورِ طاہت کا بھی نام دیا ہے۔ اس نسبت کے تین شعبے ہیں۔

پہلا شعبہ "علاوت مناجات" کا ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اللہ تبارک و تعالیٰ کو ناز، ذکر و اذکار اور دعاؤں سے مستغرق کے ضمن میں یاد کرتا ہے تو نماز و ذکر و اذکار کے اعمال و الفاظ میں غیب کا جو رخ پر عید ہے، لامحالہ سالک کی توجہ اور مہذول ہو جاتی ہے اور اس کا نفس مطلقہ اجالی اور ضمنی طور پر غیب سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اور اسے اس میں لذت ملنے لگتی ہے۔ چنانچہ اس طرح توجہ غیب کا یہ بلکہ اس کے جوہر روح میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بظاہر سادگت و خاموش ہے۔ لیکن اس کا دل اس کیفیت سے پُر ہے۔ غیب کی طرف سالک کی

یہ توبہ ایک احمالی کیفیت رکھتی ہے۔ اس لئے اُسے تلاوتِ مناجات، آرامِ دل، رغبتِ بدکار اور اسی طرح کے دوسرے ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

”توبہ غیب کی اس احمالی کیفیت کے حصول کے بعد مالک طبیباً کثرت سے ذکر و دعا کرتا اور بہت زیادہ توبہ و استغفار میں مشغول رہتا ہے ان امور کو دلی رغبت سے بجا لاکر دراصل وہ اپنے فطری تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ اور اپنی بصیرت اور مطالعہ کی مدد سے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اگر ایک کھڑی وہ ان مشاغل کو نہ کرے تو اس کا دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور اس کی حالت اس عاشق کی سی ہو جاتی ہے جو اپنے محبوب کو جدا ہو گیا ہو۔ لیکن اس کے بعد اگر وہ پھر ان اشغال کو کرنے لگے تو انہی کو وہی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور وہ پھر اس سے لذت اندوز ہو گئے۔ آٹھ مرتبہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کیفیت کے لئے صبح و شام کا ذکر، افتاحی و عائیں، رکوع و سجود، دنیا و آخرت کی ہیواری نے لئے اصرار و اصرار سے دعائیں کرنا اور جن دامن کے شر سے خدا کی پناہ چاہنا وغیرہ امور کو لازمی قرار دیا ہے۔

توبہ غیب کی اس کیفیت کے حصول کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ”تمت لخصۃ دینی دین عبدی الخ“ کی حقیقت کو اپنے ٹھونڈے خاطر رکھے یعنی اُسے اس بات پر یقین ہو کہ بندہ جو کچھ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے خدا نے

رب العزت بندے کی ان معروضات کو سنا اور اُسی کا جواب دیتا ہے
 جیسا کہ اوپر کی حدیث میں وارد ہوا ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ
 خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے ناز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان
 تقسیم کر دیا ہے جب بندۃ الحمد سر رب العالمین کہتا ہے تو اس کے
 جواب میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی اور
 جب بندۃ الرحمن کہتا ہے تو فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری
 ثنا کی، اور جب بندۃ المکرم الہم الدین کہتا ہے تو اس کے جواب میں
 اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری بزرگی بیان کی اور جب بندۃ
 آیات اللہ و آیات نعمتیں کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے کہ یہ چیز خاص میری
 اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے۔ اور جب بندۃ احمدنا
 الصراط المستقیم الی آخرہ کہتا ہے تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ چیز خاص
 میرے بندے کے لئے ہے اور میں نے اپنے بندہ کا سوال پورا کر دیا
 ہے۔ غرضیکہ جو شخص توجہ غیب کی اس کیفیت کو حاصل کرنا چاہے
 اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ طویل سب سے کرے دعا و استغفار میں
 اسرارِ اصلاح کرے اور کثرت سے ذکر و اذکار کرے۔ اس بات کا بھی خیال رہے کہ
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری پیغمبروں نے اللہ کی ذات میں غور و فکر کرنے
 کا ہرگز حکم نہیں فرمایا، بیشک آپؐ نے کئی افعال اور دعائیں اقوال کے ضمن میں
 اس بات کی ضرورت اجازت دی ہے۔ چنانچہ یہی آپؐ کے بسد صحابہ
 کا سلک تھا، اور اسی پر تابعین کا عمل رہا۔

نسبت سیکڑ کا دوسرا شعبہ شمول رحمت کا ہے۔ اس کی کیفیت سمجھنے کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے۔ بات یہ ہے کہ جب نفس ناطقہ میں جہلی طور سے اور نیز کوشش و محنت کی مدد سے یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ملائکہ سے الہام قبول کر سکے تو اس منزل میں اس کے نفس کی صلاحیتیں اپنے کمال کو پہنچتی ہیں اور اس کی یہی قوت کے شعلے بجو جاتے ہیں۔ اس وقت اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ قوت یہی کیسے معدوم ہو جاتی ہے یا اس میں کوئی کمی آ جاتی ہے بلکہ یہی قوت کے شعلے بجھ جانے سے مراد یہ ہے کہ نفس پر ملکی قوت کا غلبہ ہوتا ہے اور انسان کی یہی قوت ملکی قوت کے رنگوں میں کسی رنگ میں نہ لگ جاتی ہے۔ یہ مقام انسانی کمالات میں سے ایک کمال ہے۔ اور جو شخص اس کمال کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جائے، اس کے سامنے راحت اور پاکیزگی سے بھرا ہوا ایک دریا کے بے کراں ظہور پذیر ہوتا ہے اور وہ اس میں سے جتنا زیادہ سے زیادہ پیتا ہے، اسی قدر اس کی پاکیزگی بڑھتی جاتی ہے۔

تعالیٰ اللہ ذہے دریائے پرشور کر نور نشین آرد شنگی زور
گرا زوے تشہ صد جرحہ فوشد برے جرحہ نہ گیر خرد شد
نزدت این گفتگو از چوں واجد نہ آب آخر خود نے تشہ خور شد
حق سبحانہ کا یہ فضل و کرم ہے کہ اس نے نسبت شمول رحمت کی اس کیفیت کے اکتاب کے چند طریقے مقرر فرما دیئے ہیں جن پر عام:

خاص اور ذکی و فنی یکساں طور پر عمل کر سکتے ہیں۔ حق سبحانہ نے ان طریقوں کو انبیاء مجیدہم السلام کی زبانوں سے ظہن کے لئے واضح بھی فرمادیا۔ جنہوں نے امت کے ان طریق اکتساب کالپ باب یہ ہے کہ اول تو سالک کے دل پر ذات حق کے عقیدے کا پورا پورا تسلط ہو۔ اور اس کے بعد سالک اپنے اعضا و جوارح کو ان اعمال کا عادی بنائے جن کی صورتیں مدت ہائے دراز سے طارعت کے ذہنوں میں شکن ہیں۔ اور ان اعمال کی خوبی کا نقش و راں پوری طرح جم چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات میں کامل اعتقاد کے معنی یہ ہیں کہ اس کی مرضی پر سالک پوری دل جمعی اور ثابت قدمی سے اپنی رضا مندی کا عزم ! مجزم کرے۔ اور اپنے آپ کو کلیتہً اس راہ و سطر پر لگا دے جس میں کہ نفس کی جلائی اور بہتری ہے۔ اس کے بعد اعضا و جوارح کی اعمال کا عادی ہے۔ سوال کی حقیقت یہ ہے کہ طارعت جن کی تائید توبہ کا مقصد و انسانوں کی تکمیل ہے۔ یہ اعمال ان طارعت کے ذہنوں میں متشکل ہو چکے ہوتے ہیں۔ طارعت میں ان اعمال کے تشکل کی مثال یوں سمجھئے کہ ہم میں سے ایک شخص ایک تخت بنانے کا مشاق ہے۔ چنانچہ یہ شخص اس تخت کی صورت کو اپنے ذہن میں اس طرح جاگزیں کر رہا ہے گویا کہ وہ تخت کو ادی شکل میں اپنے سامنے دیکھ رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اعمال طارعت کے ذہنوں میں کیسے متشکل ہو گئے؟ اس کی صورت یوں ہوئی کہ خدا کے صالح اور نیکو کار بندوں

نے تسلماً بعد تسلماً ان اعمال ہی کے ذریعہ اشرقتا ہے۔ کا قُرب و حوْزِ رُاد و
 ان بزرگوں کی نیکیوں کے صحیفے ان اعمال ہی سے بھرے گئے۔ چنانچہ
 اس وجہ سے ان اعمال کو طارِ اعلیٰ میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہو گئی
 اب حالت یہ ہے کہ جب کوئی شخص ان اعمال کو سیکھاتا ہے تو طارِ اعلیٰ
 کی جانب سے اس شخص کی طرف رضا و سرور کی ایک رُو ہر جلتی ہے۔ اس
 کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ ان اعمال کی صورتیں صالحین کے ذہنوں اور ان
 کے جوارح میں موجود ہوتی ہیں اور یہی وہ صورتیں ہیں جو طارِ اعلیٰ میں
 نقش ہو چکی ہیں۔ چنانچہ ان اعمال کے کرنے سے آدمی میں یہ استعداد پیدا
 ہو جاتی ہے کہ وہ طارِ اعلیٰ کے الہام کو قبول کر سکے۔

اس ضمن میں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ طارِ اعلیٰ یعنی اونے درجے
 کے فرشتے طارِ اعلیٰ کو رضا و پسندیدگی کی کیفیات اخذ کرتے ہیں۔ اور یہ
 فرشتے ذکر کرنے والے اشخاص کے ارد گرد حلقہ باندھ جاتے ہیں یا ان
 کے نیچے اپنے بازو دکھاتے ہیں اور رُشا فوں اور بہائم کے دلوں میں اس
 بات کا الہام کرتے ہیں کہ وہ ان ذکر کرنے والوں کو ہر جانب سے
 نفع پہنچائیں۔ چنانچہ اس طرح یہ چیزیں ان کی جان، ان کے مال
 اور ان کی اولاد کے لئے خیر و برکت اور آسودگی و سلامتی کا باعث
 بنتی ہیں۔

”نسبتِ شمولِ رحمت کی اصل حقیقت کی وضاحت سے پہلے جو
 مقدمہ ضروری تھا، اس کا تو بیان ہو چکا اس کے بعد اب معلوم

ہونا چاہیے کہ بارہا اس امر کا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ ذکر کی مجالس میں اور خاص طور پر جب وہ مجالس ذکر مساجد میں قائم ہوں۔ ذاکرین کی جماعت جب نماز و ذکر میں مشغول ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھی نہیں گزرتی کہ ان پر ملائکہ کی طرف سے برکات نازل ہوتی ہیں اور یہ برکات نسیم مطہر کی طرح ان کے نفوس کا احاطہ کرتی ہیں، خواہ فکرین کی یہ جماعت اس وقت حضوری و مناجات الی صفت سے مستغنی ہو چکی ہو یا نہ ہو رہی ہو اور نیز اس ضمن میں اس امر کا بھی بارہا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ جب کوئی شخص ہم "اللہ کا ذکر پوری طرح خدا اور ترخیل کے ساتھ کرتا ہے تو اس ہم مبارک کی صورت خداوندی کی مانند اُن ملائکہ کے نفوس میں نقش ہو جاتی ہے، جو ذکر پر مشغول ہیں، اور جب یہ شخص بکثرت ذکر کرتا ہے تو اس مبارک کی یہ صورت اُن فرشتوں سے اوپر جو اور فرشتے ہیں، ان کے نفوس میں نقش ہو جاتی ہے، اور اس طرف یہ صورت نقل کرتے کرتے غبطۃ اقدس کے مقام میں پہنچ جاتی ہے، اور وہاں سے یہ صورت تہلی الہی میں جو شخص اکبر کے لئے ہنرِ دل کے ہے، جاگزیں ہو جاتی ہے اور یہ جو ہمارے سر پر مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ "فرشتہ جب اُسے لے کر اوپر چڑھتا ہے تو رحمن کا چہرہ اس سے شریا جاتا ہے" تو اس سے یہی معنی وارد ہیں۔

بعض دفعہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نور نے ذکر کے گرد و پیش کو احاطہ کر لیا اور اس سے ذکر کے ارد گرد کی ساری فضا بقعہ نور ہو گئی۔ باقی ان حالات کو اللہ جبر ہا نسا ہے۔ الغرض محض ذکر سے فضا کا پر نور ہو جانا یہی بات جس کی بنا پر شارع نے نماز کے نئے عضو کی شرط نہیں لگائی۔ یعنی بعض دفعہ محض زبان سے خدا کا ذکر کرنا ہی فیضان نور کا باعث ہے۔ اسی طرح طاعات کی بھی بہت سی قسمیں ایسی ہیں کہ گویا طاعات وہ منا پنا کی قبتل نہیں ہوتیں۔ لیکن یہ برکات کے نزول کا باعث ضرور بن جاتی ہیں چنانچہ اسی بنا پر رکن کے کہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی طاعات قربانی دینا، غارت کعبہ کا طواف کرنا، صفا و مردہ کے درمیان سعی، کعبہ کی زیارت، روزہ، صدقہ، جہاد، عریض کی عیادت، جنازے کے ساتھ جانا، اور اسی طرح کے اور اعمال خیر ہیں۔

نسبت شمول رحمت کے حصول کے ضمن میں ہوتا یہ ہے کہ جوں جوں انسان ان اعمال و اذکار کو کرتا ہے، اس کا نفس بتدریج شمول رحمت کے رجب کو قبول کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ رنگ اس کے لئے منتقل ملک کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس فقیر کے نزدیک یہ حدیث ”وہ قرب مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے جو کسی بندے نے فرائض کو سر انجام دینے سے حاصل کیا ہو۔ نیز میرا بندہ فواغل سے برابر میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس

کا اقدس بن جانا ہوں میں سے دو کپڑا ہے اور اس کے پاؤں بن جانا
 ہوں میں سے وہ چٹا ہے " اسی مطلب کی وضاحت کرتی ہے ۔
 " غمول رحمت کی یہ صفت چونکہ فرائض میں بیشتر پائی جاتی ہے اس
 لئے حق سبحانہ کی محبت ، طہارت کی وساطت سے اسی جانب زیادہ
 غفلت رہتی ہے ۔ اور جب کوئی شخص کثرت سے نوافل ادا کرتا ہے
 تو حق سبحانہ کی طرف کو ایک نور ملائکہ کے نور کے توسط سے اس شخص کی روح
 میں داخل ہوتا ہے ۔ اور اس طرح اس شخص کی روح کو گھیر رہا ہے کہ
 اس کی روح کا تمام ترقیام و انکسار اس نور پر ہو جاتا ہے یعنی حق سبحانہ
 کا یہ نور اس شخص کی روح کے لئے قیوم بن جاتا ہے ۔ اور یہی نور سبب
 بنتا ہے اس شخص کی دعاؤں کے قبول ہونے کا اور ذریعہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا
 اور بری چیزوں سے اس کے بچنے کا ۔ اور یہ امر بار بار مشاہدہ میں آچکا ہے ۔
 حق سبحانہ کے نور کا ایک شخص کی روح کا قیوم بن جانا ، اس کی مثال ایسی
 ہے جیسے کہ کپڑے کا ایک شیر یا پھلی ہو ۔ اور ان میں ہوا بھری جائے
 اور ہوا کی وجہ سے یہ حرکت کرنے لگیں ۔ اب اس ہوا میں پانی کے جزا
 بھی تھے ، چنانچہ پانی کا اثر ہوا کے ذریعہ سے کپڑے کے اس شیر یا پھلی
 کے ہر ہر عضو میں پہنچ گیا ۔

امجد شیراں دے مشیر علم جنبش از باد باد دم دم
 نور الہی کی تیز بیت کی اس حقیقت کو سب سے بہتر تو خود اقدس
 تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے چنانچہ سورہ نور میں ارشاد فرمایا

مثال نورہ کشکوۃ فیہ مصباح یعنی اشرف قاضی کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کہ طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو حضرت ابن عباس نے اس آیت کو یوں پڑھا ہے ”مثال نورہ فی قلب المؤمن کشکوۃ فیہا مصباح“ یعنی اشرف کا وزجیب المؤمن کے قلب میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک طاق ہو۔ اور اس میں چراغ رکھا ہوا ہو۔

”شمس رحمت کی نسبت کا تیسرا شعبہ اسمائے الہیہ کے انوار میں نفس کا رنچا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت بیان کرنے سے پہلے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے۔ معلوم ہوتا چاہئے کہ اسمائے الہیہ خواہ وہ اسمائے ہدایت ہوں جیسے کہ اشرف، رحمن اور رحیم ہیں، یا وہ اسمائے مرکب ہوں جیسے قرآن مجید کی وہ آیتیں اور دعائیں ہیں، جو ذات واجب کی صفات پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً آیت اکرسی، قل ہوا اللہ احد یا سورہ مشرک آخری آیتیں۔ ان فرض مذاقائے کے یہ سبب اور مرکب اسماء عالم مثال میں اپنی مستقل صورتوں کے ساتھ موجود اور قائم ہیں، چنانچہ میں نے سبب ان کی مثالی صورتوں کو نظر حق دیکھا تو مجھ پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ اسمائے الہیہ کی ان صورتوں کے عناصر بدن تو ذات شالیہ سے ہیں، اور ان کا حتمی طار اعظم کی طرف سے ہے۔ اور ان صورتوں کی روح ان اسماء کی اپنی ذاتی اور اضافی صفات ہیں، ذاتی صفات جیسے اشرف، رحمن اور رحیم۔ اور اضافی صفات جیسے رزاق اور قہار وغیرہ ہیں اس کے ساتھ میں نے یہ بھی دیکھا کہ عالم مثال میں اسماء کی یہ

صورتیں اور قالب سرتا پا فوری فوری ہیں۔

مقدور قویاں ختم ہو گیا۔ اب ان اسمائے الہیہ کے رنگ میں نفس کے رنگے جانے کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اس شخص میں جانتا جائے کہ مرد و عورت جب ان اسمائے الہیہ کا کچی نیست اور پوری توجہ سے ذکر کرتا ہے۔ اور اس کا دل ان اسماء کو اپنے اندر محفوظ کرنے کی جدوجہد میں کلیتہً مصروف ہو جاتا ہے تو اس شخص کے باطن کی طرف اسمائے الہی کی ان مثالی صورتوں سے ایک دروازہ کھلتا ہے جس سے اس کے دل پر نور اور تھنک کا نزول ہوتا ہے اور وہ اس کیفیت میں بڑی لذت محسوس کرتا ہے۔ اس شخص کو جب ان اسماء کے ذکر میں لذت ملتی ہے تو وہ اور زیادہ حق دہی اور محبت سے اس ذکر میں لگ جاتا ہے۔ چنانچہ جتنی زیادہ حق دہی سے وہ ان اسماء کا ذکر کرتا ہے۔ اسی حساب سے اس پر انوار کا فیضان بڑھتا جاتا ہے اور درجہ اعلیٰ ہی وہ سبب ہے جس کی بناء پر انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ جو دعائیں مانتر اور مقرر ہیں۔ دعا کرنے والا ان دعاؤں کے الفاظ اور صیغوں کا پورا پورا لحاظ رکھے۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے ان اسماء الہی میں سے بعض کو اہم و عظم قرار دیا ہے۔ اور بعض دعاؤں کی خاص خاص تاثیرات بیان فرمائیں۔ اور اسی لئے اس سلسلہ میں انہوں نے اس امر کو ضروری تسلیم نہیں کیا کہ دعاؤں کی تاثیر صرف اُن ہی وقت ہوگی جب کہ دعا کرنے والا ان دعاؤں کے خواص سے واقف ہو چکا ہو چنانچہ ذکر

کی مجالس میں بار بار یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جوں ہی فاکر کی زبان سے
 "اللہ" کا اسم نکلا تو فوراً ہی اس اسم سے ایک عظیم ہشام حقیقت بڑے
 جوش و خروش سے ظاہر ہوئی اور اس نے فاکر کے دل کو گھیر لیا۔ اللہ
 کے اسم کی اس حقیقت سے ایک شاہراہ جو بڑی کشادہ ہے ذات
 حق کی طرف کھلتی ہے۔

(اس شخص میں فطرتاً ہی بات سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ دھوت پہنار
 والوں میں سے جب کوئی شخص اسماء الہی میں سے کسی اسم کے ذکر میں
 مشغول ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس اسم کی اس قدر طاقت کرتا ہے کہ اس
 اسم کا عالم مثال میں جو قالب ہے۔ اس تلاوت کرنے والا کا دل اس
 مثالی قالب کی حقیقت سے متصل ہو جاتا ہے تو اس کے اور اس اسم
 کے درمیان ایک کشادہ راہ کھلتی ہے۔ اور اس کے بعد اس اسم کے
 مخصوص آثار و خواہ وہ عالم نفس میں ہوں یا عالم آفاق ہیں، اس اسم
 کی طرف ذرا سی توجہ کرنے یا اس اسم کے فورے ربط پیدا کرنے سے
 تلاوت کرنے والے پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح ایک عبادت گزار
 جب نماز، ذکر اور دوسری طاعات میں مشغول ہوتا ہے۔ اور کثرت

یہ عبارت مہات کے نقلی نسخے میں جو سن ۱۳۵۷ھ کا لکھا ہوا ہے موجود ہے انہیں کتابچے
 مطبوعہ نسخے میں یہ عبارت نیچے مدنیہ میں ان الفاظ کے ساتھ درج ہے "میں نے بعض نسخوں میں
 یہاں یہ عبارت بھی دیکھی ہے۔ معلوم نہیں اصل کتاب میں سے ہے یا بعد کے لفظات میں کی۔"

سے نماز پڑھنا اور ذکر و طاعات کرتا ہے تو اس طاعت کا نور جو عالم مثال میں اپنی ایک مستقل صورت رکھتا ہے۔ اس عبادت گزار سے اتصال پیدا کر لیتا ہے۔ اور اس کے نفس کا احاطہ کر کے یہ نور اس کا مرنی بن جاتا ہے۔ الغرض ان احوال میں سے کسی حال میں بھی جب مالک اپنی مشغولیت کو اس نور سے پیوستہ کر دیتا ہے۔ اور وہ اس کی طرف تکیہ متوجہ ہو جاتا ہے تو اس مقام پر پہنچ کر یہ نفس تو اسے الہی کو النفس یعنی لوگوں کے نفوس اور آفاق یعنی عالم کائنات میں برسر کار لانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ نبی اسرائیل کے عابدوں کو بھی نسبت حاصل تھی اور ان کی دعاؤں کا قبول ہونا اور اس طرح کے اور عجیب عجیب آثار کرامات جو ان سے ظاہر ہوتے تھے، اسی نسبت کی برکت سے ان کو یہ خصوصیت حاصل تھی۔

اس نسبت کو حاصل کرنے کا سب سے قیمتی طریقہ یہ ہے کہ اسم اُتد کا ذکر کیا جائے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ذکر کے وقت دل باز اور ریح سے فارغ ہو چکا ہو۔ ذکر کو چاہئے کہ ذکر کے وقت نئے سرے سے دھندو طہارت کرے۔ اور ایک ہزار بار اسم اُتد کا ذکر کرنے کے بعد ورد پڑھے۔ ذکر کرتے وقت وہ لفظ اُتد کی تشدید پر زور دے اور اس لفظ کو اس کے صحیح خروج سے نکالے۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دوران ذکر میں وہ اس نور کا تصور کرتا جائے۔ جو فضا میں بھیلے ہوئے

چنانچہ جب وہ اس طریق سے چند ہزار بار اسمِ اقدس کا ذکر کرے گا تو یقیناً اس نور سے اس کا اتصال ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہ حالت ہوگی کہ اگر یہ شخص بیس، تحمید، تہلیل، تکبیر، استغفار، اور احوال پڑھنے کی طرف ذرا سی توجہ کرے گا تو وہ نور ان صفات کے رنگ میں جن کی طرف بیس و تحمید کے یہ کلمات اشارہ کرتے ہیں، متشکل ہو کر اُسے نظر آنے لگے گا اور اس کے آثار بھی "جہانِ انفس و آفاق" میں ظاہر ہوں گے۔

اس نسبت کو ناز میں حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ساکب ناز کو توہم کرے۔ اور ناز کی رکعات زیادہ سے زیادہ ہوں۔ اور ناز کے دوران میں وہ بار بار تازہ وضو کرے۔ اور فضائیں جو نور الہی پھیلا ہو جائے، اس کا برابر تصور کرتا جائے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جلد ارکان کے ساتھ ناز میں زیادہ رکعتیں پڑھنا اس نور کو پیدا کرتا ہے اور نیز استغفار و دعاؤں کے پڑھنے سے بھی ملاوتِ مناجات کی نسبت حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان امور میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

یہاں اس امر کی بھی صراحت کر دینا ضروری ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض صوفیاء یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ناز میں کمالِ خشوع و خضوع نہیں ہوتا اس لئے ناز سے کوئی فائدہ نہیں ان لوگوں کی یہ باتیں محض از قسم "علم" ہیں اور ان کا ناز کو بے فائدہ سمجھنا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ملاوتِ ذکر کی نسبت سے واقف نہیں۔

الغرض اسم آتش کا ذکر ذات باری کی طرف تین جہت سے پر داز کرتا ہے۔ ایک ملائکہ کی جہت سے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، اور دوسرا خود اس اسم اور عالم مثال میں جو اس کی شکل ہے، اس جہت سے۔ اور تیسرے نفس ناطقہ کے ذریعہ، یعنی نفس ناطقہ میں اس ذکر سے بہت پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ ترقی کر کے خلیفۃ القدس کے مقام تک پہنچ جاتا ہے باقی الشرائع امور کو بہتر جانتا ہے۔

یہ کہ ”قصۃ مختصر“ علامت مناجات“ شمول رحمت“ اور انوار اسمائے الہیہ میں تینوں کے تینوں شعبے طاعات کے ذیل میں آجاتے ہیں اور ان سے گاتر انبستوں کا حصول ہی طاعات کا مقصد ہے بعض طاعات ایسی ہوتی ہیں جن میں ”علامت مناجات“ زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعض ایسی ہیں جن میں ”شمول رحمت“ زیادہ۔ اور بعض میں ”انوار اسماء“ کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس خفیہ کو اس امر سے بھی مطلع کیا گیا ہے کہ مجذوب و غیر مجذوب دونوں کے دونوں عالم برزخ، عالم قیامت اور اس کے بعد جو منازل ہیں ان سب میں یکساں ہوں گے۔ اور جس طرح کہ آج اس زندگی میں شرعی اور عرفی احکام کے معاملہ میں عارف اور مبتدی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ اور ان میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاتی اسی طرح مجذوب و غیر مجذوب کے درمیان کوئی تفاوت نہیں ہوگا۔ باقی رہا مجذوب کی مجذوبیت کا مسئلہ، سو وہ تو اس کا اپنا ایک ذاتی کمال ہے جس کا معاملہ اس کے اور اشرکے درمیان ہے۔ مجذوب نے یہ مجذوبیت

کسی غرض کے لئے حاصل نہیں کی تھی، اس کا مقصود تو مجذوبیت کو شخص مجذوبیت کی خاطر حاصل کرنا تھا، نہ کہ اُسے کسی دوسری چیز کے حصول کا ذریعہ بنانا۔

الغرض اس زندگی کے بعد آخرت میں انسان کو جو بھی عزت و رفعت ملے گی، وہ اس کی اسی نسبت کیلئے کا قیام ہوگی، جس کے یہ تین شعبے عبادتِ مباحات، قبولِ رحمت اور انوارِ اسما کے الہی ہیں۔ اس ضمن میں مجھے اس شخص کی حالت پر بڑا تعجب ہوتا ہے، جو کیلئے کی اس نسبت کی طرف مطلق انکساف نہیں کرتا، بلکہ اس کے خلاف وہ پہنچتا ہے کہ اس نسبت سے اس کے کاروبار میں غفل پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ اس علمی نسبت سے میرے خیالات میں تشویش پیدا ہوتی ہے، لیکن کیا یہ شخص نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام اور ان کے بعد جو تابعین تھے، ان کی زندگیوں میں بھی نسبت سب سے روشن تھی۔ بہر حال کل حزب یا مدحیم فرعون ہر شخص اپنی اپنی پسند پر نازاں ہوتا ہے۔ اور جو کچھ بھی اُسے مل جائے وہ اسی پر چڑا نہیں سکتا۔

نسبتِ اولیہ

ان نسبتوں میں سے جو اربابِ تصوف کے یہاں بہتر ہیں، ایک نسبتِ اولیہ ہے۔ نسبتِ اولیہ کو بھارت اور چین کی نسبتوں کے درمیان بڑا سمجھئے۔ یعنی یہ ان دونوں سے ربط رکھتی ہے۔

نسبتِ اولیہ کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں ایک نفسِ ناظمہ ہے جو منزلِ ایک آگے کے ہے۔ جس میں انسان کی روحانی کیفیات کا بھی عکس پڑتا ہے۔ اور اس کے مہمانی احوال کا بھی۔ انسان کی روحانی کیفیات اور ان کے مہمانی احوال میں سے مراد کیفیت اور حالت کے لئے اس میں قدرت نے ایک استعداد رکھی ہے چنانچہ اسکی وہ استعدادیں جن کا تعلق مہمانی احوال سے ہے اور وہ استعدادیں جو اس کی روحانی کیفیات سے متعلق ہیں ان دونوں میں کی تناظر و اختلاف ہے۔ روحانی کیفیات میں سے ایک کیفیت یہ ہے کہ سائلین راہِ طریقت جب عالمِ ماسوت کی پستی سے نکل کر عالمِ ملکوت کی بلندی

پرفائز ہوتے ہیں۔ اور خدیس اور ناپاک اعتبارات کو کلیتہً ترک کر دیتے ہیں تو اس حالت میں وہ طبعیت اور خوشگوار کیفیات میں اس طرح سفار ہو جاتے ہیں، گو ! ان کے نفوس ان کیفیات میں ڈوب کر بالکل خام ہو گئے چنانچہ اس مقام میں ان سالکوں کی حالت اس مشک کی سی ہو جاتی ہے جس میں پوری قوت سے ہوا بھر دی گئی ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ اس طرح پھول گئی ہے کہ خواہ اسے آپ پانی میں ڈال دیں، وہ کسی طرح تہ آب نہیں ہوتی۔

ان نفوس کو جب یہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے تو اس وقت ان کے آئینہ دل پر اوپر سے ایک رنگ فائض ہوتا ہے جس کی برکت سے ان کو نیک روحوں سے خاص مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نیز ان نیک روحوں کی کیفیات مثلاً انس و سرور، الشراح قلبی، عالم حبیب کی طرف جذب و توجہ اور ان حقائق استہبار کا انکشاف جو دوسروں کے لئے راز سریت کا حکم رکھتے ہیں، غرضیکہ ان نیک روحوں کے ساتھ اس طرح کی مناسبت سے یہ نفوس ان کیفیات سے بہرہ مند ہو جاتے ہیں۔ اب یہ دوسرا سوال ہے کہ یہ مناسبت انبیاء کی نیک روحوں سے ہو یا اولیائے امت کی روحوں سے یا فرشتوں سے۔

بہا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سالک کو کسی خاص روح سے خصوصی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس طرح کہ سالک نے اس بزرگ کے فضائل کئے۔ اور اس سے اس بزرگ سے غیر معمولی محبت ہو گئی۔ چنانچہ اس

نسبت کی وجہ سے سالک اور اس بزرگ کی روح کے درمیان ایک شانہ
 راہ مکمل ہوتی ہے۔ یا یہ ہوتا ہے کہ یہ خاص روح جس سے کہ سالک کو
 مناسبت خصہ میں پیدا ہو گئی اس کے مرشد یا آباؤ اجداد میں کسی بزرگ
 کی روح تھی۔ اور اس بزرگ کی روح میں ان لوگوں کے لئے جو اس سے
 منسوب ہیں، ارشاد و ہدایت کی محبت موجود ہے۔ یا ان ہوتا ہے کہ سالک
 اپنے فطری جذبے یا جبلتی تقاضے سے جس کا کہ سمجھنا نہایت مشکل ہے کسی
 خاص روح سے مناسبت پیدا کر لیتا ہے۔ چنانچہ سالک اس بزرگ کو
 خواب میں دیکھتا ہے۔ اور اس سے مستفید ہوتا ہے۔

یہ فقیر جب عالم ارواح کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے وہاں ارواح
 کی یہ یہ جلتے دیکھے۔

ایک ماہ اعلیٰ کا طبقہ — اس طبقے میں میں نے عالی مرتبہ اور
 کائنات کا انتظام کرنے والے فرشتوں مثلاً جبرائیل اور میکائیل کو پایا
 نیز میں نے اس مقام پر بعض ایسے انسانی نفوس کو دیکھا کہ وہ ان طاغوتوں
 سے نمٹ رہے ہیں اور سر نہا یا ان کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جب کسی سالک
 کو اس طبقے کے ساتھ نسبت اور بعض ماحصل ہو تو اس کی خصوصیت
 یہ ہوتی ہے کہ سالک کے لوح دل پر ذات باری کی صورت عینی اس
 طرح نقش ہو جاتی ہے کہ کائنات کے انتظام کے سلسلہ میں قدرت الہی

لے احوال۔ ہم سے بزرگ ہونے کے عالم کو جو دیکھا اجداد ہے۔ اسباب کے توسط سے کی چیز
 (وہی صفت سالک ہے)

کے یہ چار کمالات یعنی ابد جمع، خلق، تدبیر اور تہلی ایک ہی بار اس تصورِ علمی کے ضمن میں اس کے دل پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور سالک کو قدرت الہی کے ان چار کمالات کا علم بغیر کسی ارادے اور قصد کے اور بدون غور و فکر سے کام لے حاصل ہو جاتا ہے۔ اور بہا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظامِ عالم کے متعلق جو کلی تدبیریں اور عمومی فیصلے خطرۃ القدس میں طے ہوئے ہیں، نسبت اور سی کی تاثیر سے یہ خود بخود سالک کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ یہ نسبت بیشتر انبیاء کو حاصل ہوتی ہے اور جو علوم و معارف انبیاء سے ظاہر ہوئے ہیں، وہ اکثر اسی نسبت کے سرچشمے سے بہوتے ہیں۔

ملا، اسطے کے بعد میں نے عالم ارواح میں ایک دوسرا طبقہ ملا، سالک کا دینا۔ جس شخص کو اس طبقے سے نسبت اور سی حاصل ہو، اُس کی علامت یہ ہے کہ اُسے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں فرشتے نظر آتے ہیں۔ اور فرشتوں کی جماعت جن کاموں پر مامور ہے۔ سالک ان کو ان کاموں کو کرتا اور اس ضمن میں آتے جاتے دیکھتا ہے۔ اور وہ انھیں جانتا اور پہچانتا بھی ہے۔

عالم ارواح کا تیسرا طبقہ مشائخ صوفیہ کی ارواح کا ہے۔ یہ ارواح نیز منظر

معرضِ وجود میں ناظرین ہے۔ صانع کے پیش نظر خلق کے اسباب میں تعریف کرنا تدبیر کرنا اور اس عالم بابت اور جو عالم ہے، اس میں جو درجہ ای حروف کا ہے، اُسے تدلی کہتے ہیں۔ مرقم

خواہ مجموعی طور پر کیجا ہوں یا فرداً فرداً الگ۔ جس شخص کو اس طبقے سے نسبت ایسی حاصل ہوتی ہے، ضروری ہے کہ اسے اس نسبت کی وجہ سے صوفیا کی ان ارواح سے عشق و محبت پیدا ہو اور وہ فنا فی المشائخ ہو جائے۔ اس حالت میں فنا فی المشائخ کی یہ کیفیت اس کی زندگی کے ہر پہلو میں موثر ہوتی ہے۔ جیسے کہ درخت کی جڑوں میں پانی دیا جاتا ہے تو اس پانی کا اثر تازگی کی صورت میں درخت کی ہر شاخ، ہر پتی، اور اس کے پھولوں اور پھل تک میں سرایت کر جاتا ہے۔ لیکن فنا فی المشائخ کی اس نسبت سے ہر شخص میں ایک سی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس کی وجہ سے ایک شخص پر ایک حال وارد ہوتا ہے، اور دوسرے پر ایک دوسری کیفیت طاری ہوتی ہے۔ فنا فی المشائخ کی نسبت کے سلسلہ میں مشائخ کے عرسوں کا قیام، ان کی قبروں کی پابندی سے زیارت کرنا۔ وہاں جا کر فاتحہ پڑھنا، ان کی ارواح کے نام سے صدقہ دینا۔ ان کے آثار و تبرکات، ان کی اولاد اور ان کے متعلقین کی تعلیم و تکریم میں پورا پورا اہتمام کرنا۔ یہ سب امور داخل ہیں۔

ادھر کی ان نسبتوں میں سے جس شخص کو کوئی نسبت بھی حاصل ہوگی، وہ لازمی طور پر اس خاص نسبت کے آثار کی طرف طبعاً میلان رکھے گا خواہ اس نے اس نسبت کے متعلق کسی سے کچھ سنا ہو یا نہ سنا ہو۔ یا کسی کو اس حال میں دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو۔ اس شخص کا اس خاص نسبت

کی طرف یہ میلان طبعی اور فطری ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک شخص جب جوان ہوتا ہے، اور اس کے اندر مادہ متویہ پیدا ہو جاتا ہے تو احوال اس کو بیوی کی خواہش ہوتی ہے۔ اور انہیں کے دل میں بیوی کے لئے عشق و محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

الغرض سالک جب ان نسبتوں میں سے کسی ایک نسبت کو بہرہ مند ہو جاتا ہے تو عالم ارواح کے طبقوں میں سے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے جس طبقے کی بھی وہ نسبت ہوتی ہے، اس طبقے کی ارواح کو وہ خواہش میں دیکھتا ہے اور ان کے فوہن سے مستفید ہوتا ہے اور جب کبھی زندگی میں اُسے خطرات اور مصائب پیش آتے ہیں تو عالم ارواح کے اس طبقے کی صورتیں اس کے رو برد ظاہر ہوتی ہیں اور اس ظہن میں ان کی جو بھی شکل مل جاتی ہے، وہ اُسے ارواح کی ان صورتوں کی طرح منسوب کرتا ہے۔ مختصر یہ اور اس طرح کی اور چیزیں جو اُسے حاصل ہوتی ہیں، وہ اسی نسبت کا ثمرہ ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ نسبت اور ہی رکھنے والے کو اس خاص نسبت کی جو ارواح ہیں، ان سے اس طرح کا ربط پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ چیز اس شخص کی روح کے جوہر اصلی میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور وہ بیداری اور حالت خواب میں اس کیفیت کو اپنے اندر یکساں پاتا ہے۔ لیکن جب یہ شخص سوتا ہے اور اس کے ظاہری جو اس نفسانی خواہش کے اثر و تصرف سے امن میں ہوتے ہیں اور وہ فی الجملہ طبیعت کے

فحاصلوں اور اس کے احکام سے رہائی حاصل کر لیتا ہے، تو اس حالت میں وہ تمام صورتیں جو اس کے دل کے اندر جمع ہوتی ہیں، خواب میں برعکس طور پر اس کو اپنے سامنے نظر آتی ہیں اور وہ ان کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سالک پر اس مقام میں عجیب عجیب چیزیں اور طرح طرح کے معاملات ظاہر ہوتے ہیں۔

الفرض ان ایسی نسبتوں میں سے سالک کو کسی نسبت سے بھی تعلق ہو۔ مجموعی طور پر ان سب نسبتوں کا حاصل یہ ہے کہ سالک دنیا میں طرح طرح کے واقعات دیکھتا، اور اچھی اچھی خوش خبریاں سنتا ہے۔ اور نیز دوسرے لوگ اس کے متعلق جو خوابیں دیکھتے ہیں اور ان خوابوں میں اس شخص کی غفلت و بخلال کے جو شواہد انھیں نظر آتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ لوگ اس کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ نیز اس شخص کو مصائب اور پریشانیوں میں غیب سے مدد ملتی ہے۔ اور وہ اکثر اپنی معاش کے معاملات میں نمایندہ غیبی کو مصروف عمل پاتا ہے۔ اسی طرح وہ سالک جو کسی ظاہری پیر کے بغیر صوفیائے کرام کے طریقے پر گامزن ہیں۔ اور انھیں ہی گمنامی "تہذیب" اور راحت کی کیفیات بھی میسر ہیں۔ اور نیز غفلت اور مصروفیت کے تمام مواقع کے باوجود ان کی توجہ غیب سے نہیں ہٹتی۔ ان سالکوں کی یہ حالت یقیناً اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان کو ارواح کے ساتھ نسبت ایسی حاصل ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ تفصیل؟

اس نسبت سے واقف ہوں یا انہیں اس نسبت کا سرے سے علم ہی نہ ہو۔
 اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ اس سے پہلے اولیائے اُمت کی پاک
 رُوحوں کی بڑی کثرت تھی۔ ارفضا اُن سے بھری ہوئی تھی۔ وہ لوگ جن
 میں استعداد ہوتی، انہیں ان پاک رُوحوں کے توسط سے ملاکہ مقربین
 کی یہ نسبت حاصل ہو جاتی اور اس مقام سے ان کے لئے نبوت اور
 حکمت کے علوم مترشح ہوتے۔ چنانچہ اس نسبت رکھنے والوں میں کُر
 بس کو انسانوں کے لئے مبعوث کیا جاتا، اُسے لوگ نبی کہتے، اور جواں
 طرح انسانوں کے لئے مبعوث نہ ہوتا، وہ حکیم اور محدث کہلاتا۔ لیکن جب
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمل میں آئی۔ اور آپ کی بعثت
 کی جو صورت عالم مثال میں تھی، وہ اس عالم و جہام میں منتقل ہو گئی، اُو
 اس سے یہ ساری فضا بھر گئی اور یہاں کثرت سے ارواح امت بھی
 پیدا ہو گئیں تو اس کی وجہ سے وہ کیفیت جو آپ کی بعثت سے پہلے تھی
 لوگوں کی نظروں سے رو پوش ہو گئی، یعنی اس طرح جس طرح کہ فضا
 میں گٹھا جھانسانے سے آفتاب آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے جو
 بھی چیز اس عالم میں ظاہر ہوتی ہے، لامحالہ دوسرے عالم میں جسے
 عالم مثال کہتے ہیں، اس چیز کی ایک نہ ایک شکل اور صورت ہوتی
 ہے، جس کی طرف یہ چیز منسوب ہوتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص عالم
 عیب کی طرف توجہ کرتا ہے تو عالم عیب کی بھی اس کی طرف توجہ ہوتی

ہے۔ لیکن عالم غیب کی یہ قوبہ اُسے ہمیشہ متکل نظر آتی ہے۔ قوبہ عالم غیب کے اس مثالی منظر کا قالب رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے جس شخص نے کسب سے پہلے تہذیب کا دروازہ کھولا، اور اس راہ پر وہ سب سے پہلے گامزن ہوئے، وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے تمام سلسلے ان کی طرف منسوب ہیں۔ گویا سلسلوں کا تعلق باعقبارِ حق کے حضرت علیؑ سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ یہ معلوم ہو سکا ہے کہ آخر من بھری کے ساتھ حضرت علیؑ کا کون سا خصوصی علاقہ تھا، جو آپ کا دوسروں کے ساتھ نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود تمام کے تمام صوفیاء کا نسلاً بعد نسل اس بات پر اتفاق چلا آتا ہے کہ طریقت کے سارے سلسلے حضرت علیؑ کی طرف راجع ہیں۔ ظاہر ہے ان بزرگوں کا یہ اتفاق بغیر کسی وجہ کے نہیں ہو سکتا۔ فقیر کے نزدیک جو کہ حضرت علیؑ اس اُمت

ان تصوف کے سلسلوں کا خیر و بین بیان کیا گیا ہے کہ رسالت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تصوف کے ساری لہذا حضرت علیؑ نے حامل کئے اور ان سے حضرت من بھری نے ان صوفیوں کو نکد کیا اور پھر ان سے صوفیاء کے تمام سلسلے چلتے ہیں امام ولی اللہؒ نے اہل بیت میں کہ حضرت علیؑ سے حضرت من بھری کا اتصال اہل اُلوں سے آپ کا خرقہ خلافت پہنانا اہل تشیع کے اہل ثابت ہے، اور نہ اہل سنت کے یہاں۔

کے پہلے مجذوب ہیں، اس لئے طریقت کے تمام سلسلے آپ کی طرف منسوب ہیں۔

حضرت علیؑ کے بعد ادویائے کرام اور اصحاب طرق کا سلسلہ چلتا ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ قوی الاثر بزرگ جنہوں نے راہ جذبہ کو باطن و جہوئے کر کے نسبت ادویہ کی اصل کی طرف رجوع کیا اور ان میں نہایت کامیابی سے قدم رکھا، وہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات گرامی ہیں۔ اسی بناء پر آپ کے متعلق کہا گیا ہے کہ موصوف اپنی قبر میں زندوں کی طرح تصرف کرتے ہیں۔ اس ضمن میں فقیر کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر کا مسلک طریقت یہ ہے کہ جذبہ کی راہ کو طے کرنے کے بعد نسبت ادویہ کا جو حاصل مقصود ہے، اس کے رنگ میں سالک اپنے آپ کو رنگ دے۔ مزید برآں علت مصطفویٰ میں بالعموم اور اس زمانے میں خاص طور پر ان دونوں بزرگوں یعنی حضرت علیؑ و شیخ عبدالقادرؒ جیلانیؒ سے بڑھ کر کوئی اور بزرگ خرقہ عادات اور کرامات میں مشہور نہیں ہیں، اس لئے ان کی یہ شہرت اس امر کا تقاضہ کرتی ہے کہ سالک جب عالم غیب کی توجہ کو اپنی طرف مبذول پائے تو وہ اس توجہ کو ان بزرگوں میں سے کسی نہ کسی صورت میں متشکل دیکھے۔ الغرض ان ابو کے پیش نظر آج اگر سالک کو کسی خاص روح سے مناسبت حاصل ہو جائے اور وہاں سے اسے فیض پہنچے تو اس واقعہ کی اصل حقیقت غالباً یہ ہوگی کہ اسے یہ فیض یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے حاصل ہوا یا

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت سے یا اسے یہ فیض حضرت خورشید اعظم کی نسبت سے ملا۔

راہ طریقت کے بعض سالک ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں تمام ارواح کو نسبت حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح کی نسبت بالعموم عارضی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مثلاً سالک کو اس بزرگ سے غیر معمولی محبت ہے اور اس بزرگ کی قبر پر وہ اکثر جاتا ہے۔ اس نسبت کا انحصار ایک تو سالک کی اپنی استعداد پر ہوتا ہے کہ اس میں فیض حاصل کرنے کی خود کئی قابلیت ہے۔ دوسری چیز اس خاص بزرگ کا اخلاق و قیود ہے جس سے سالک کو ربط ہوتا ہے۔ اب اگر وہ بزرگ اپنے سلسلہ کے متعلقین کی تربیت میں بڑی ہمت رکھتا تھا۔ اور اس کو یا سے انفعال کے بعد بھی اُس کی روح میں تاثیر و تصرف کی یہ محبت ہنوز باقی ہے تو اس اعتبار سے سالک کے باطن میں اس نسبت کو پیدا کرنے میں مرشد کا اثر بڑا کام کہے گا۔ اس سلسلہ میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سالک کو ایسی نسبت کو تمام عالم ارواح سے بالا جمال حاصل ہوتی ہے لیکن بعض اسباب ایسے ہوتے ہیں جنہیں کی وجہ سے یہ نسبت تمام ارواح کی بجائے کسی خاص بزرگ کی صورت میں شخص نظر آتی ہے۔

یہ فہرست مشائخ صوفیہ کی ارواح کی طرف متوجہ ہو۔ تو اس نے ان کی توجہ اور اس کے اخراجات کو مختلف صورتوں میں اپنے اندر منعکس پایا۔ اس توجہ کے اخراجات میں سے ایک آخر یہ تھا کہ اس سے طبیعت کی یہی قوتیں یکسر علی رنگ میں اس طرح رنگی گئیں، گو یا کہ حیثیت ملکیت میں بالکل

نام ہو گئی۔ اس سلسلہ میں بغیر کو بتایا گیا ہے کہ جب مشائخ صوفیا کو انحال فرمائے ہار سو سال یا پانچ سو سال یا اس کے قریب گزر جائے ہیں تو ان کے غصے کی جی قوتیں جو زندگی میں اُن کی ارواح کو خاص بھر و صورت میں ظاہر ہونے نہیں دیتی تھیں، اتنا عرصہ گزرنے کے بعد یہ طبیعتیں بے اثر ہو جاتی ہیں، اور اس دوران میں اُن نفوس کے ”نمر“ یعنی روح ہوائی کے اجزاء منتشر ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں جب ان مشائخ کی قبور کی طرف توجہ کی جاتی ہے، تو ان مشائخ کی ارواح سے اس توجہ کرنے والے کی روح پر ایک رنگ کا فیضان ہوتا ہے۔ اس فیضان کی مثال ایسی ہے جیسے آفتاب کسی مرطوب چیز پر اپنی شعاعیں ڈالے۔ اور اُن کی گرمی سے یہ رغوبت غلیل ہو جائے۔ اور اس مرطوب چیز سے پانی کے قطرات پگھلنے لگیں۔ یا اس کی مثال یوں سمجھئے کہ توجہ کرنے والے کی روح ایک حوض کے مشابہ ہے، جو پانی سے بھرا ہوا ہے۔ اور آفتاب کی روشنی نے ہر طرف سے اس کا احاطہ کر لیا ہے۔ چنانچہ وہ حوض آفتاب کی شعاعوں سے اس طرح چمک اٹھتا ہے گویا کہ وہ حوض خود سرتاپا ایک شمع بن گیا ہے۔ اور اوج مشائخ کی طرف توجہ کرنے والا سالک جب اس منزل میں پہنچتا ہے، تو اس میں یادداشت یا ”توجہ بجانب غیب“ کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ کیفیت اُس شخص کی روح کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہے۔

ان امور کے ضمن میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ توجہ ارواح کا اثر

وہیج ہوتا ہے ایک تویہ کہ توبہ کرنے والا اپنی روح کی اس حالت کا تصور کرے۔ جو حالت کہ مرنے کے بعد قبر میں اس کی ہوگی۔ اس کے بعد وہ روح کی اس حالت کو اپنے اوپر ظاہری کرے۔ اس سے اس شخص پر ایک رنگ کا فیضان ہوگا۔ سالک کو چاہئے کہ وہ اس رنگ میں غور و تامل کرے اور اس کی حقیقت کو پہچاننے کی کوشش کرے، بالکل ہی طرح میں طرح کہ آئہ مقیاس ظل سے آفتاب کی بندی ناپی جاتی ہے یا جیسے ایک شخص اپنے چہرہ کو آئینے میں دیکھتا اور اُسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔

توبہ ارواح کی آخر آفرینی کی دوسری قسم یہ ہے کہ مثلاً سالک نے ایک بزرگ کی قبر پر توبہ کی، چنانچہ صاحبِ قبر کی روح اُس پر شکست ہوگئی اور سالک نے اُس بزرگ کی روحانی کیفیات کا واضح طور پر مشاہدہ کر لیا۔ بعینہ اسی طرح جیسے کوئی شخص آنکھ کھولے اور اُس کے سامنے جو چیز پڑی جو اُسے وہ اچھی طرح سے دیکھ لے۔ لیکن یاد رہے کہ سالک کا یہ دیکھنا چشم ظاہر سے نہیں بلکہ چشم باطن سے ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اس سلسلہ میں یہ بھی جانتا ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو فطری طور پر ملائکہ مقربین سے جو کائنات کے مدبر اور منتظم ہیں، خاص نسبت حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی نسبت کی وجہ سے انبیاء کے سامنے نفوسِ افلاک، ملائکہ اور نیز اُن کی تجلی حق کی

طرف جو کہ شخص اکبر کے دل پر قائم ہے، ایک کشادہ راہ کھل جاتی ہے اور وہاں سے ان کے نفوس پر مکی علم کی صورت کا فیضان ہوتا ہے۔ چنانچہ مکی علم کی موجودگی میں انبیاء کو تفصیلی علوم کی ضرورت نہیں رہتی۔ عقلی صورت کا یہ فیضان انبیاء کے نفوس پر جس طریق سے ہوتا ہے۔ یہ طریق راہِ جذب اور راہِ سلوک سے ایک الگ چیز ہے۔ لیکن یہ جاننے کے باوجود جو لوگ انبیاء کے کلام کو وحدت الوجود پر عمل کرتے ہیں، وہ نہ تو انبیاء کی حیثیت کو پہچانتے ہیں۔ اور نہ انہیں انبیاء کے خصوصی مسلک کی کچھ خبر ہے۔

نہ عالم علوی اور مکی دونوں کے مجوس کا نام شخص اکبر ہے۔ شخص اکبر کے نفس کو ہم نفسِ کلیہ کہتے ہیں۔ اور اس کے بعد یا جسم کو حیدرِ کل۔۔۔

مترجم

نسبتِ یادداشت

ان نسبتوں میں سے ہر ایک کا تعلق راہِ جذب سے ہے، ایک نسبت یادداشت کی بھی ہے۔ نسبتِ یادداشت کی وضاحت سے پہلے پسند شدہ ہر راہ، لفظ، مقدمہ کے ساتھ، کا ملاحظہ فرمائیے۔

باب آٹھ میں چیز کا علم حاصل کیے ہیں، خواہ وہ چیز از سم جبر ہو یا چیز تخیل سے یعنی جگہ گھبرنے والی ہو یا وہ تخیل کے مشابہات میں سے ہو، تو ہمارے اس علم کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ ہمارے ذہن میں اس چیز کی ایک صورت منقش ہو جاتی ہے۔ اور یہ ذہنی صورت آگے چل کر زور پیدافزائی ہے، اس چیز کی اصل حقیقت کے انکشاف کا یہی باب ہم نے کسی چیز کا علم حاصل کیا، تو گویا ہماری نظر اس صورت سے، جو اس چیز کی ہمارے ذہن میں تھی، گزر کر اس چیز کی حقیقت تک پہنچ گئی، اس کی ایک مثال تو یوں سمجھئے جیسا کہ عینک

میں سے جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو ہماری نظر بینک میں سے گزرتی
 کر اصل چیز تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اس وقت بینک کا وجود ہمارے
 خیال سے بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم یوں محسوس کرتے ہیں
 کہ ہماری نظر براہ راست اس چیز کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس کی
 دوسری مثال یہ ہے کہ ایک درخت نہر کے کنارے کھڑا ہے۔ اوپر
 اُس کا سایہ پانی میں پڑ رہا ہے۔ اب ایک شخص ہے جو اس درخت
 کے سایے کی طرف بالکل نظر لگا کر دیکھ رہا ہے۔ اور وہ اس کے دیکھنے
 میں اتنا محو ہو گیا کہ پانی کا خیال اس کے ذہن سے بالکل ہٹا رہا۔

کسی چیز کے علم حاصل کرنے کی یہ عقل جو اوپر مذکور ہوئی اُس
 کے متعلق اہل حکمت کے دو گروہ ہیں، قدیم حکما کا تو یہ خیال تھا کہ
 جب نفس ناخلاق کسی چیز کا علم حاصل کرتا ہے، تو اس وقت نفس ناخلاق
 اس چیز کے ساتھ جس کا اُس نے علم حاصل کیا، متحد ہو جاتا ہے۔ اور
 بعد کے حکما کہتے ہیں کہ کسی چیز کو معلوم کرنے کے سلسلہ میں ذہن میں
 اس چیز کی جو صورت بنتی ہے، تو یہ صورت علمی مدینہ وہ اصل چیز
 ہوتی ہے، جو معلوم ہوئی۔ ان فرض کسی چیز کو معلوم کرتے وقت اس چیز
 کی جو علمی صورت ہمارے ذہن میں نقش ہوتی ہے تو اس ضمن میں
 مندرجہ ذیل دو حالتیں پیش آتی ہیں۔ ایک یہ کہ نئے معلوم کی طرف
 ہماری پوری توجہ منتقل ہو جائے۔ اور اُس لمحے کی جو علمی صورت
 ہمارے ذہن میں پہلے سے موجود ہے، اس کی حیثیت بینک کی سی

ہو جائے کہ ہماری نظر اس میں سے گزر کر شے معلوم کا علم حاصل کرنی ہے۔ اس نوعیت علمی کو علم شے کا نام دیا گیا ہے۔ اور دوسری حالت یہ ہوگی کہ شے معلوم کی بجائے اس شے کی جو علمی صورت ذہن میں ہو، اس کی طرف ہماری پوری توجہ ہو۔ اور اس دوران میں اگر حاصل شے کی طرف ہماری نظر جائے بھی تو محض غمنی اور اجمالی طور پر۔ اس نوعیت علمی کو "علم الحکم" کہا جاتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ دوسری حالت اور پہلی حالت میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر دوسری حالت کی پوری نگہداشت کی جائے تو اس سے پہلی حالت کی استعداد بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے رد و پوش ہونے کے بعد اس کی قائم مقام بن جاتی ہے۔

الغرض شے مجرد ہو یا شے متخیر ان دونوں کا علم حاصل کرنے کی توجہ کی یہ دو صورتیں ہوں گی۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کا ذہن حق سبحانہ کی تخلیق کا علم کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں یہ جانا چاہیے کہ جب تخلیق جن صورتوں اور احوال کے رنگ میں ظہور پیرا ہو اور اس وقت انسان کے حواس نفسانی تقاضوں سے امن میں ہوں تو اس کی روح تخیل کی صورت کی طرف کلیتہً متوجہ ہو جاتی ہے اور یہ صورت اس کے لئے نصب العین کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان کو تخیل کی صورت کا مشاہدہ صرف خواب ہی میں ہو۔ بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی جاگ رہا ہے۔

اور اس کے جو اس نفس کی خواہشات سے غارت ہیں، تو اس بیداری میں بھی اس کو تجلی کی صورت نظر آ جاتی ہے۔ لیکن یہ لازمی نہیں رہتا کہ تجلی کی علمی صورت ہمیشہ کسی قسم کی شکل کیفیت اور حیز کے بغیر ہی انسان کو نظر آ کرے۔

تجلی اشکاف اور صورتوں میں کیوں ظہور پذیر ہوتی ہے، اس ضمن میں مسلم ہونا چاہیے کہ انسان میں اندر قاسم نے دو قوتیں دلویت فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک تجلی کی قوت ہے، وہ چیزیں جو ذاتی طور پر کوئی شکل نہیں رکھتیں۔ اس قوت کا کام یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو نظروں کے سامنے غشکل کر دیتی ہے۔ چنانچہ قوت تجلی کی مدد سے انسان غضب اور غصے کو درندے کی شکل میں اور حرص و طمع کو کوسے کی صورت میں مجسم کر دیتا ہے۔ اور دوسری قوت متوہ ہے یہ قوت اختیار کو شکل و رنگ سے محروم کر کے انھیں معانی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ قوت متوہ ہر جس طرح کام کرتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ ہم نے ایک شخص کو جسے ہم ایک عرصہ پہلے دیکھ چکے تھے، جو نہی یاد کیا تو مٹا ہمیں اختیاتی ہوا کہ اس شخص کی صورت کو خیمہ تصور کے سامنے لائیں۔ اب یوں ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس شخص خیمہ ایک اجالی اور کلی صورت ہمارے سامنے آتی ہے یہ صورت اتنی عام ہوتی ہے کہ نہ صرف اس شخص پر، بلکہ اس کے علاوہ اور بہت سے اشخاص پر بھی یہ صورت منطبق ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ صورت کٹتی جاتی ہے

اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خاص اس شخص کی صورت جسے ہم نے یاد کیا تھا۔ ہمارے ذہن پر آ موجود ہوتی ہے۔ اس طرح بعض دفعہ ایک حافظ قرآن کو اجمالی طور پر یاد آتا ہے کہ فلاں آیت اس سورۃ میں ہے۔ اس شخص میں پہلے تو اس کے ذہن میں اس آیت کی ایک اجمالی سی صورت آتی ہے۔ یہ اجمالی صورت اس مخصوص آیت کے علاوہ اور بہت سی آیات پر بھی محمول ہو سکتی ہے۔ بعد ازاں تدریج یہ صورت معین ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ آخر میں اس آیت کی خاص صورت ذہن میں آ جاتی ہے۔ انفرض انسان کی قوت تحلیل اگر مجرد معانی کو اشکال اور صورتوں کا لباس پہناتی ہے تو اس کی قوت متوجہ متخیز اشیا کو مجرد معانی میں بدل دیتی ہے۔ چنانچہ ذہن کا سلی منہوات کا ادراک اور افراد سے کلی امور کا استخراج کرنا یہ سب کچھ انسان کی اسی قوت متوجہ کی اعجاز کاروں کا نتیجہ ہے۔

نسبت یادداشت کی وضاحت سے پہلے جن قہیدی امور کا جائنا ضروری تھا، ان کا اس مقدمے میں بیان ہو چکا ہے۔ اب ہم نسبت یادداشت کے منطق اصل بحث پر آتے ہیں۔ عارف مجذوب جب نسبت بے نقاتی کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد جب کبھی وہ اس نسبت کی طرف پوری دل جمعی سے متوجہ ہوتا ہے، تو اس حالت میں اس کے تمام قوائے اور احساسات کلیتہً اس حقیقت کے تابع ہو جاتے ہیں جو اس کے ذہن نے ادراک

کی تھی۔ یہاں عارف کی قوت متوہمہ میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے، جو اجمالی طور پر اس حقیقت کے نشانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس منزل میں اس خیال کی کوئی تخصیص وضع، شکل یا صورت نہیں ہوتی، بلکہ اس کی نوعیت ایک خاص معنوی ہئیت کی ہوتی ہے۔ یہی معنوی ہئیت تجلی حق ہے جو عارف کی قوت متوہمہ میں نازل ہوئی، اسی طرح جب یہ معنوی ہئیت قوت متوہمہ کی بجائے عارف کی قوت متعبدہ کو اپنا آماجگاہ بناتی ہے تو عارف کے خیال میں ایک صورت آمو جو دہرتی ہے اور اُسے عارف تجلی حق سمجھتا ہے۔ البتہ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کی تجلی دہری ہوتی ہے۔ اور دوسری قسم کی تجلی تجلی خیالی۔ عارف جب تجلی دہری کو پالیتا ہے تو پھر وہ اس کی باقاعدہ حفاظت کرتا ہے اور اس پر برابر نظر رکھتا ہے۔ تجلی دہری کی اس طرح حفاظت اور نگہداشت کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عارف کے سامنے ”مرتبہ بے نشانی“ کی طرف ایک کشادہ راہ کھل جاتی ہے۔ اور اس سے اُس کے اندر بڑی استعداد پیدا ہو جاتی ہے، مشائخ میں سے جس بزرگ نے سب سے پہلے یہ راہ اختیار کی، اور اس طریقے کو اپنا مسلک بنایا، اور اس کی طرف اپنے اصحاب کو متوجہ کیا، اور وہ خود بھی ہر تن اس میں لگ گئے۔ چنانچہ اس ضمن میں جو کچھ انہوں نے کہا، اس مقام سے کہا، اور جو کچھ کیا، اسی مقام سے کیا۔ وہ بزرگ خواجہ نقشبند ہیں۔ اس طریقے کو وہ دوامِ مراتب کہتے تھے۔ اور اگر

انہوں نے توجہ خاص کا بھی نام دیا تھا۔

خواجہ نقشبند کے بعد خواجہ مجید احمد احرار آئے، اور انہوں نے جذب کے اس طریقے کو اور مختصر کر دیا۔ دل کا مرتبہ بے نشانی کی طرف مائل ہوتا۔ اور اس کے سوا دل میں کسی اور خواہش کا باقی نہ رہتا۔ اور نیز ہذبہ محبت کی انتہائی کیفیت میں سرشار ہو کر چشم دل کو مسلسل اسی جانب متوجہ کر دیتا۔ خواجہ احرار نے ان کیفیات کو راہ جذب کا خلاصہ قرار دیا۔ چنانچہ اس طرح راہ جذب کا یہ مختصر طریقہ پیدا ہو گیا۔ اس طریقہ میں فیض پانے اور دوسروں کو فیض پہنچانے کا سارا دار و مدار حاصل محبت پر ہے۔

خواجہ احرار کے بعد ایک زمانہ دراز گزر گیا۔ اور اس دوران میں راہ جذب کی اس کیفیت میں جو سینہ بہ سینہ برابر چلی آتی تھی، تغیر رونما ہوا۔ چنانچہ اس کیفیت میں مرتبہ بے نشانی کی طرف جو میلان پایا جاتا تھا۔ وہ مفقود ہو گیا۔ اور اس کی بجائے سالکوں نے اس چیز کو جو اصل ایمان میں داخل ہے۔ اور اس پر وہ پہلے سے ایمان لائے تھے، اپنا نصب العین بنایا۔ یہاں سے وہ آگے نہیں بڑھے بلکہ اسی مقام میں وہ رُک گئے۔ اور اصل ایمان کی اس چیز کی نقائص میں کوشاں ہوئے، اور انہوں نے اسی نسبت کی تکمیل کی۔ اور اسی کے قیام میں وہ مصروف ہو گئے۔ اور وہ سمجھے کہ ہم نے اہل مقصود کو پایا۔

میرا بولہلی کے مقبضین میں سے عوامی ہی نسبت رکھتے تھے۔ اور
 فقیر نے ان میں سے ایک بڑی جماعت کو دیکھا جی ہے۔ ان میں سے
 وہ لوگ، جو اسمِ اشرار کو اپنے خیال میں موجود اور حاضر پانے ہیں
 اور وہ اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ اُن کی نسبت زیادہ مناسب
 اور موزوں ہے۔ اور جن کے خیال میں اسمِ اشرار کا تصور قائم نہیں
 ہے، اُن کے نزدیک یہ نسبت اس شخص کے مشابہ ہے جس کے
 حواس سکڑ اور مستی کی کیفیات سے سرشار ہوں۔ غرضیکہ اہلِ ہذب
 کے نزدیک اس نسبت کے درُخ ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسرا
 باطنی۔ اس نسبت کے ظاہری رُخ سے مراد ایک ایسی کیفیت ہے،
 جو انسان کے فہم میں جاگزیں ہو کر اُس سے کلیتہً ملحق ہو جاتی ہے
 اور اسی نسبت کا باطنی رُخ تبے نشانی محض ہے، جس کو کہ صرف
 روح مجرد ہی ادراک کر سکتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کو جذب کی
 توفیق نہیں ملتی، وہ اس نسبت کو صرف اپنے فہم ہی میں موقوف اور
 غالب دیکھتے ہیں۔ اس لئے وہ اس مقام سے اوپر اس نسبت کا
 کوئی اور وجود تسلیم نہیں کرتے۔

اس نسبت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے
 کہ جس شخص کو یہ نسبت حاصل ہو، وہ "وجود عدم" کی استعداد رکھتا
 ہے۔ "وجود عدم" کے معنی یہ ہیں کہ عارف جب مرتبہ بے نشانی کی
 طرف متوجہ ہو گا تو اس میں نہ تو گرد و پیش کی اشیاء کا کچھ ادراک باقی رہے

اور نہ ادھر ادھر کے خیالات اس کے ذہن میں داخل ہوں۔ اور اس نسبت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نسبت کی وجہ سے سالک پر ایسی قوی تاثیر طاری ہو جاتی ہے کہ وہ ایک نگاہِ مسمولیٰ کی توجہ سے "وجود عدم" کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ اور جو اس کی تشویشات سے اُسے کلی طور پر نجات مل جاتی ہے۔ اور اسی نسبت کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ اس سے سالک کی محبت میں تیزی اور جدت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اس کی قوت عزم شخص بکریک جا پہنچتی ہے چنانچہ کم سنوں کو محبت بندھا، امرائے کو دور کرنا اور اس طرح کے اور تصرفات کرنے کی توفیق اسی نسبت کی طفیل حاصل ہوتی ہے اور کشف و اشراق کے ذریعہ دوسروں کے دُش کے احوال جاننا بھی اسی نسبت کا ثمر ہوتا ہے۔

نسبتِ توحید

ان نسبتوں میں سے ایک نسبتِ توحید ہے۔ اور نسبتِ توحید کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے چند امور کا جائنا ضروری ہے۔ یہ امر کہ انسان اور سب کے سب کے سب انسان ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ انسان کے علاوہ باقی تمام افراد انسانی اس ایک بات میں کہ یہ سب کے سب انسان ہیں، ایک دوسرے سے مشترک ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے ہر ایک فرداً فرداً ایک دوسرے سے جدا جدا بھی ہیں۔ انفرادیت سب باعتبار انسانیت کے تو آپس میں مشترک ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی انفرادی خصوصیات کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ زید، عمرو اور بکر وغیرہ میں فرداً فرداً بر خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہ انفرادی خصوصیات عین انسان

نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ خصوصیات عین انسان ہوتیں تو ذیہنس جمشٹ اصل مشابہ ہوتا عرو کے اور عرو مشابہ ہوتا بکر کے۔ اور اسی طرح ہر انسان کلیشہ دوسرے انسان کی شکل ہوتا۔ اور ان میں فرداً فرداً ایک دوسرے سے کوئی امتیاز نہ پایا جاتا۔ لیکن یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ذیہ بچہ نہ بکر نہیں اور نہ بکر بچہ نہ ہے۔ اسی ہذا القیاس ہر انسان وہ نہیں جو دوسرا ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم نوع انسانی کے ان افراد کی الگ الگ خصوصیات کو عین انسان قرار دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک چیز ایک وقت دوسرے کی عین ہی ہے۔ اور اس سے غلط بھی۔ اور ظاہر ہے یہ بات صریحاً و بدیہاً غلط ہے۔

لیکن افراد کی یہ انفرادی خصوصیات ہر حقیقت سے غیر انسانی ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ جس ذات میں یہ خصوصیات جمشٹ ہوتی ہیں اس پر انسان کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور یہ انفرادی خصوصیات اس امر میں مانع بھی نہیں ہیں کہ اُن پر انسان کا اسم صادق نہ آ سکے۔ الغرض کل انسانیت میں حقیقت مجموعی اور افراد کی ان جدا جدا خصوصیات میں ایک خاص نسبت پائی جاتی ہے جسے ظاہریت اور منظریت کہ تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کالا بھی انسان ہے۔ اور یہ سفید رنگ کا بھی انسان ہے۔ پہلی صورت میں یہ ہوا کہ جو ہر انسانیت کا لی شکل سے مرکب ہو کر ایک خاص منظر میں ظاہر ہوا اور دوسری صورت میں ہی جو ہر سفید شکل سے مخلوط ہو کر دوسرے منظر میں معرضِ ظہور میں آیا۔

انسانیت میں بشیت مجموعی اور افراد کی، انفرادی خصوصیات میں جو نسبت ہے۔ اس نسبت کو کبھی مادہ و صورت کی مثال دے کر بھی واضح کیا جاتا ہے مثلاً ایک بھبکا ہے جو آگ پر رکھا ہوا ہے، اور اس کے اندر پانی ہے۔ پانی حرارت سے بخارات یعنی ہوا بنا۔ اور ہوا سے پھر عرق یعنی دوبارہ پانی بن گیا۔ اب واقعہ یہ ہے کہ ایک صورت جسمیہ ہے، جو کہ تمام اجسام میں مشترک ہے۔ یہ صورت جسمیہ پہلے پانی تھی پھر یہ ہوا ہوئی، اور اس کے بعد پھر پانی ہو گئی۔ اس حالت میں کوئی نہیں کہتا کہ پانی اور ہوا کوئی الگ چیز تھی جو صورت جسمیہ سے ختم ہو گئی ہے۔ کیونکہ صورت جسمیہ تو خود اپنی جگہ تقطیل ہے۔ اور اس قسم میں نہ وہ پانی کی محتاج ہے، اور نہ ہوا کی۔ بے شک یہ صورت جسمیہ جب انواع کے مرتبہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس کے لئے تقطیل اور منگولت ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے اس صورت جسمیہ کا اس حالت میں پانی یا ہوا کے علاوہ کسی اور شکل میں مشکل ہونا ممکن نہیں۔ الغرض جب ہم صورت جسمیہ کو صورت جسمیہ کے مرتبہ میں دیکھیں گے تو بیشک ڈیٹام اجسام میں مشترک نظر آئے گی۔ لیکن جب صورت جسمیہ کو ہم اس اعتبار سے دیکھیں گے کہ مرتبہ انواع میں وہ کیوں کو مشکل ہوئی، تو اس حالت میں اس صورت جسمیہ کا خود پانی یا ہوا ہونا ضروری ہوگا یہ نہیں کہ صورت جسمیہ ایک الگ چیز ہے، اور پانی اور ہوا الگ اور پانی ہوا بعد میں اس کو ختم ہو گئے۔ اگرچہ اپنی جگہ ان کے ختم ہونے کی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔

الغرض صورت اور ماوسے کے درمیان جو خاص نسبت ہے اس کے لئے ایک نام کی ضرورت ہے۔ جس سے کہ اس نسبت کو تعبیر کیا جائے۔ ہم نے اس نسبت کو تھوڑا کا نام دیا ہے۔ اوّل ظہور سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز اپنی جگہ ایک موطن اور مرتبہ میں قائم اور متعین ہے۔ اور پھر وہی چیز اس مرتبہ سے اُتر کر دوسرے مرتبہ میں ایک اور جگہ کا ہمارے پہنچتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک چیز کی ایک نوعی صورت ہے۔ جو اس نوع کے ہر فرد میں ظہور کرتی ہے۔ یا پھر موم کی مثال سمجھئے کہ اُس سے سدس اور مروج شکلیں اور انسان اور گھوڑے کے مجسمے بنائے جاسکتے ہیں۔ اور اس طرح ان تمام چیزوں میں موم اپنے مومی جسم کا اظہار کرتا ہے یا پھر اس کی مثال حکماء کا اس علمی صورت میں جو ابھی ہمارے ذہن میں نقش پذیر ہوئی۔ ظہور کرتا ہے۔ اس ضمن میں اس طرح کی اور بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اور اگر حقیقت ظہور کی مزید توضیح درکار ہو اور اُس کی اقسام کا مفصل بیان چاہیے تو اس کے لئے ہماری دوسری تصانیف دیکھئے

فقہ مختصر، انسان ہوا گھوڑا، گھائے ہوا بکری، اونٹ ہوا گدھا ان میں سے ہر ایک کی صورت اپنے اپنے مرتبہ نوع میں متعین ہے اور وہاں ہر ایک کے اپنے اپنے نوعی احکام و آثار بھی مقرر ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک پر فرداً فرداً جو احکام وارد ہوتے ہیں، ان کے لئے

ہر نوع کو افراد کی صورتوں میں لامحالہ ظہور پذیر ہوتا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس طرح ایک نوعی صورت سے افراد کی الگ الگ صورتیں وجود میں آئیں اور ہر صورت میں اس نوع کے جو افراد ہی آثار و خواص لے گئے، وہ مرتب ہوئے۔ یہ سب انواع اور افراد خواہ وہ از قبیل انسان ہوں یا گھوڑے، لگائے، بکری، اونٹ اور گدھے وغیرہ کی قسم سے، ان عرض یہ سب انواع و افراد مطلقہ میں جنس حیوان کے۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ اور آگے بڑھتا ہے، یہاں تک کہ یہ جو ہر عرض تک جا پہنچا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً زید ایک فرد ہے، اس سے اوپر نوع انسان ہے، اور اس نوع سے اوپر جنس کامرتبہ ہے۔ اور یہ جنس حیوان ہے۔ حیوان کی جنس میں نوع انسان بھی داخل ہے اور جمادات کی انواع بھی۔ جنس سے آگے جنس عالی کامرتبہ ہے۔ اس میں حیوانات کے ساتھ ساتھ نباتات بھی شامل ہیں۔ اور اس سے اوپر جسم یعنی عرض کامرتبہ ہے اور عرض سے اوپر جو ہے۔ اس معاملہ میں حکما کا یہ حال ہے کہ وہ مظاہرہ سے دور اس کے قیانات کی اصل کا سراغ نکالتے نکالتے اس مقام پر پہنچے، اور یہاں پہنچ کر نہ صرف یہ کہ وہ رک گئے، بلکہ انہوں نے قطعی طور پر یہ نتیجہ نکال لیا کہ جو ہر عرض کے درمیان کوئی ایسا علاقہ نہیں جو دونوں کو ایک جنس کے تحت جمع کر دے، لیکن ان کے برعکس اہل حق نے معلوم کر لیا کہ جو ہر عرض دونوں کو ایک اور اعلیٰ تر صفات احاطہ کئے ہوئے

ہے۔ لیکن حکماء اس حقیقت کو ادراک کرنے سے اس لئے عاجز رہے کہ اور حقائق کی طرح اس حقیقت کے احکام و آثار متعین نہیں کہ ان کی مدد سے یہ حکماء اس حقیقت کا سراغ لگا لیتے، جو عرض وجود ہر دو نوبہ پر مادی ہے۔ اس حقیقت جامع کا موزوں ترین نام حقیقت وحدانیت ہے۔ گو کبھی کبھی ہم اس حقیقت کو وجود بھی کہہ لیتے ہیں۔ یہ وحدانیت یا وجود ایک بسیط حقیقت ہے۔ چنانچہ وجود میں جو اس مرتبہ بسیط میں ہے۔ اور بعد کے تعینات میں، جن میں یہ وجود ظہور پذیر ہوتا ہے، وجود کے ان درجوں مراتب میں کوئی تضاد یا تضاد نہیں پایا جاتا۔

اس مسئلہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد ہم ہر کائنات پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس میں نوع بنوع کے قدرتی اور صنعتی مرکبات مثلاً درخت، حیوان، اکائیں، تخت، کپڑے، اور اس طرح کی دوسری چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان چیزوں میں ایک قوت حقائق میں جو کفیس اشیا سے جن سے کہ آثار و احکام ظاہر ہوئے ہیں، تمیز اور الگ ہیں۔ ان حقائق کو ہم وحدانیت نامہ کہتے ہیں۔ لیکن ان حقائق یا صبر کو وقوع پذیر ہونے کے لئے ہم غصری کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہم غصری ان صورتوں کا مادہ ہے

ان قدرتی اور صنعتی مرکبات سے اوپر عناصر اور افلاک کا مرتبہ ہے اور ان عناصر اور افلاک کی جی ایک خاص صورت ہے۔ ان سب کا اوپر اور ان سب کو جمع کرنے والی، اور جو ان سب کا موضوع ہے صورت جمیعہ ہے۔

جسے اشراقیہ نے "کافراً" اولیٰ کہا ہے۔ یہ صورت جسمیہ جو اثر پذیر مادہ بھی ہے۔ اور علتِ فاعلیہ بھی، یہ صورت جسمیہ جیسا کہ ہم پہلے ذکر آئے ہیں، وجود کے اصل مرکز کی طرف راجع ہے، الغرض انواع کے ایک ایک فرد کو لے کر جو واقعی تک نظام کائنات کا یہ سارا سلسلہ نہایت مرتباً و منظم ہے۔ اور نیچے سے لے کر اوپر تک اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہے۔ الغرض یہ وجودِ واقعی، اور بعد میں جن مظاہر اور تعینات میں اس وجود کا ظہور ہوتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کلمے ہوئے حروف کے مقابلے میں سبباً و کسباً جو۔ یعنی ان حروف کی اصل تو سبباً و کسباً ہی ہے۔ مگر بعد میں اس کسب کے حروف کی شکل اختیار کر لی۔ یا جیسے مختلف اعداد کی نسبت اکائی سے ہوتی ہے۔ یعنی اکائی ہی سے تمام اعداد بنتے ہیں، اور نیز ایک ہی وجود میں مظاہر اور تعینات کی اس قدر کثرت کا واقعہ ہوتا، اس کی مثال دریا کی بجھے کہ اس میں لا تعداد اور حساب مویں ہوتی ہیں۔

الغرض اچر کی اس بحث سے یہ امر پتہ چلتا ہے کہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ ان مظاہر اور تعینات میں دو چیزیں اصل ہیں۔ ایک وجود، اور دوسرے ان چیزوں کی باہیات۔ اب سوال یہ ہے کہ اس وجود اور ان باہیات میں آپس میں کیا نسبت ہے؟ اربابِ معقولات نے اس کے متعلق بڑی طول طویل بحثیں کی ہیں۔ لیکن اس مسئلہ میں صحیح ترین رائے یہ ہے کہ وجود وہ ہے جو خود اپنی ذات میں قائم ہے، اور مرتبہ وجود میں

جب کہ کوئی اور چیز اُس کے ساتھ ملحق نہیں ہوتی، اور وہ خالص وجود ہوتا ہے، تو وہ کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ وجود مختلف اہیات میں ظہور کرتا ہے، چنانچہ یہ اہیات اس وجود کے لئے قوالب بن جاتی ہیں۔ ان اہیات میں سے ہر اہیت کی اپنی ایک حیثیت اور اس کے اپنے احکام ہوتے ہیں۔

مطلب یہ نکلا کہ وجود اہیات میں ظہور پذیر ہوتا ہے لیکن اہیات میں وجود کا ظہور پذیر ہونا موقوف ہوتا ہے بہت سی چیزوں پر۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعض اہیات میں وجود کے ظہور کے لئے ضروری ہے کہ اس سے پہلے وہ دوسری اہیت میں ظہور پذیر ہو چکا ہو۔ یعنی وجود کا ایک ظہور مشروط اور مقدم ہوتا ہے اُس کے دوسرے ظہور پر چنانچہ یہ بے شمار اہیات ظہور وجود کے اس طرح کے ایک باقاعدہ سلسلہ میں عکس بن جاتی ہیں۔ اور ہر اہیت اس سلسلہ ظہور کی ایک کڑی ہے۔ اور یہ ممکن نہیں کہ اس سلسلہ میں ایک کڑی اس کی دوسری کڑی سے مقدم یا موخر ہو سکے۔ اب اصل وجود کو دیکھئے۔ اصل وجود کے دو وصف کمال ہیں۔ ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ ہم یہاں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ ایک حساب کرنے والا ہے۔ وہ حساب کرتے وقت اپنے ذہن میں حساب کے عددوں کو موجود اور حاضر کرتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ پہلے اعداد کی یہ صورتیں اس کے ذہن میں موجود نہ تھیں۔ اب جو وہ حساب کرنے لگا تو یہ اعداد اُس کے ذہن

میں آن موجود دہرے۔ محاسب یہ تو کر سکتا ہے کہ اعداد جو اُس کے ذہن میں موجود نہ تھے، انھیں وجود میں لے آئے، لیکن یہ اُس کے بس کی بات نہیں کہ دس کے عدد کو وہ طاق بنا دے اور گیارہ کو جفت کر دے یا وہ شمار میں پچھ کو پانچ سے مقدم کر دے ان فرض مگنتی کے جو اعداد ہیں ان کا ایک مستقل سلسلہ ہے۔ اور اس سلسلہ میں ہر عدد کا ایک متعین مقام ہے۔ اور اس مقام کے مطابق ہر عدد کے اپنے احکام ہیں جن میں مساب کرنے والا کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

ماہیات کا یہ مترتب سلسلہ اور مظاہر وجود کا یہ باقاعدہ نظام اس کو دیکھ کر عقل انسانی لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ ماہیات کے سلسلہ کی یہ ترتیب بالضرورت کسی نہ کسی موطن میں پہلے ہی سے مقرر اور متعین ہو چکی ہے۔ اور پہلے سے اس مقرر شدہ ترتیب ہی کا نتیجہ ہو کہ ہر ماہیت کے ظہور کے اپنے احکام ہیں جن میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ میں طرح محاسب کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہنی عمل سے اعداد پر تاثیر ڈالتا ہے۔ اور انھیں عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ لیکن چونکہ اعداد کی ترتیب پہلے کسی موطن میں مقرر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اسی ترتیب سے اعداد کو اپنے ذہن میں مستحضر کرتا ہے۔ اور اس ضمن میں اعداد کو حکم سے وجود میں لاتے وقت وہ ان میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس دنیا میں یہ ماہیات پہلے کی طے شدہ ترتیب کے مطابق ظاہر ہوتی ہیں۔

وجود کے ایک مرتبے کی مثال تو محاسب کی یہ مثال ہوئی کہ اس نے اپنے ذہن میں اعداد کو غیر موجود سے موجود کر لیا، اور نابود سے بود بنادیا۔ اس مرتبہ وجود کو ہم ظاہر وجود کہتے ہیں۔ لیکن وجودِ باختر بذات خود بھی تو ایک چیز ہے۔ اور یہی مبدا اور اصل ہے وجود کے ان دو کمالوں یعنی ظاہر اور باطن کا۔

اب یہ سوال باقی رہا کہ یہ جامع حقیقت جو عرضِ وجود پر کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اور جس کا موزوں ترین نام ہم ”حقیقتِ واحد“ بنا آئے ہیں۔ اور جسے ہم بھی کہیں ”وجودِ یحییٰ“ کہتے ہیں۔ یہ جامع حقیقت جس کے اندر کائنات کی یہ ساری کثرت داخل ہے۔ اور یہ ساری کی ساری اہیات اُسی کی استعدادیں ہیں، اور اسی حقیقت کے ظہور کو ہم اہیات کی تخلیق کہتے ہیں۔ اور کلمات ”بست“، ”خارج“ اور ”میں“ سے اُسی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ آخر یہ حقیقت ہے کیا، ایک قوم کا کہنا ہے کہ یہ حقیقت میں ذاتِ الہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی حقیقت کو ”لا بشرطِ لشی“ ذاتِ بحت سمجھا۔ اور اسی کو وہ بشرطِ لاشی ”احدیت“ کہتے ہیں۔ اور یہی اُن کے نزدیک بشرطِ لشی ”واحدیت“ ہے۔ ہمارے خیال میں لے ذاتِ الہی یہ کائنات کے تنزل کی صورت میں بیان کی جاتی ہے۔ ایک مقام تو خود ذاتِ کائنات کے ہے۔ اس تمام پر بشرطِ لاشی کے ساتھ خود ذات کو اپنی ذات کا احاطہ ہوتا ہے۔ یہاں سے تنزلات کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس میں پہلے مرتبہ ”احدیت“ کا ہے۔ اور ”احدیت“ کے بعد ”واحدیت“ کا مرتبہ ہے۔ اس ”واحدیت“ کو ”باطنِ الوجود“ بھی کہتے ہیں (باتنی صلفہ پر نگہ کریں)

ان لوگوں میں عقل و تدبیر کی کمی تھی کہ انہوں نے اس غلط بات پر یقین کر لیا۔ ان کے برعکس غیر نے اس امر کی تحقیق کی تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وجود کے میں مرتبے پر جا کر ان لوگوں کی نظر رنگی، اور اُسے ہی انہوں نے غلطی سے ذاتِ بحت، احدیت، اور واحدیت سمجھ لیا، وہ مرتبے تو ظاہر الوجود کا تھا جس کو ہم نفسی کلیہ کہتے ہیں، اور اسی کو بعض اہل کشف نے وجود منبسط کا بھی نام دیا ہے۔ حقیقت میں اس وجود منبسط کی حیثیت تو محض اصل وجود کی طبیعتوں میں سے ایک طبیعت کی ہے بے شک وجود کی یہ طبیعت سب چیزوں سے زیادہ بسیط ہے، اور یہی سب کا مبدا اور اصل بھی ہے۔ بہر حال یہ نفس بھی یہ وجود منبسط یا اُسے آپ کوئی اور نام دے لیجئے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ ہر شے میں جاری و ساری اور ہر شے سے قریب ہے۔ اور اس کے باوجود یہ سب اشیاء سے پاک اور ان کی تمام آلائشوں سے سزا بہ ہے۔ نفس کلیہ کے مقابلے میں جو حیثیت ان اشیاء کی ہے، وہی حیثیت ذاتِ الہی کے مقابلے میں اس نفس کلیہ کی ہے۔ بلکہ نفس کلیہ اشیاء سے باوجود قرب کے جس قدر دور ہے اس سے سو کہ زیادہ ذاتِ الہی نفس کلیہ سے دُور ہے اور اسی طرح اُن کے تمام قیانات اور تقدیرات کی حد بندوں سے بھی مبرا ہے۔ ہاں اس نفس میں ایک بات کا ضرور خیال ہے۔ نفس کلیہ دو (تینا صورت) ہاں جو چیزیں وجود منبسط کا ظہور ہے جس کا دوسرا نام ظاہر الوجود بھی ہے اس مرتبے کا ظہور جو کہ نفس کلیہ کا نام لیا گیا تو نفس کلیہ کی ارواح، مثال اور جساں کا ظہور بھی

اس کی اور وجود کے جو مراتب میں، ان پر ذات الہی، از قبیل ابداع برتر ہوتی ہے، نہ کہ از قسم خلق۔ ابداع سے مراد یہ ہے کہ مادہ کے بغیر عدم سے وجود کا مدور ہو۔ اور ایک چیز سے دوسری چیز کا پیدا ہونا خلق کہلاتا ہے۔

انفرض نفس کلیہ اور ذات الہی میں خلق کی نہیں بلکہ ابداع کی نسبت ہے۔ اور ابداع کی نسبت کی حالت یہ ہے کہ اُسے عقل انسانی اور ان کے کرنے سے کلیتہً قاصر ہے۔ اس لئے نفس کلیہ اور ذات الہی میں فوقی مراتب کرنا عقلاً ممکن نہیں ہوتا، اس لئے اگر کوئی شخص تاسع سے یا آسانی کے خیال سے یہ کہہ دے کہ نفس کلیہ ذات الہی کا تنزل ہے، تو اس کا یہ کہنا اجمالاً ایک دمبر رکھنا ہے۔

[نفس کلیہ اور ذات الہی میں آپس میں کیا تعلق ہے؟ یہ تصوف کا سب سے اہم اور نازک ترین مسئلہ ہے اور اس کو صحیح طور پر سمجھے بغیر تصوف کے دقیق مسائل کو حل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ یہاں ہم اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی تصنیف شاہ ولی اللہ اور اراکین کا فلسفہ سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں۔ مترجم

”انفرض کائنات کی کثرت پر حور کرنے کے بعد انہیں اس تغیر پر پہنچا کہ ایک نفس بھی یا جس کا جناس ہے جہاں سے چاری ساری موجودات کا سر مشر ہو جاتا

نہ اس شکل مسئلہ کی وضاحت سمجھے یہ عبارت کتاب کے اہل ترجمے میں غلط فہمی کی گئی ہے۔ مترجم

بکسر جان پر نمود و مبدع اور مبدع کے درمیان کسی امتیاز کو قائم کرنے پر قادر نہیں
اس نے نفس و قدس مبدع اور مبدع یا ذات الہی اور نفس علیہ پر مجازاً وحدت
یعنی اہم ایک ہونے کا اطلاق کیا جانا ہے۔

اب مسئلہ بالکل صاف ہو گیا۔ بنے ٹک کا خاتم کی ہر چیز نفس علیہ کی میں
ہے۔ اس نے ضرور اس حالت کو بھر اور صوح کی مثال دیکر سمجھاتے ہیں لیکن سچا
اور نفس علیہ سے کے کر واجب الوجود تک جو منزل ہے اور جسے ابدی و
تغیر کیا جاتا ہے، اس کی کیفیت معلوم کرنا عقل کے میں کی بات نہیں۔ اپنے
اس کی آئینہ یعنی حقیقت معلوم ہے چنانچہ نفس علیہ اور واجب الوجود
میں جو نسبت ابداع ہے، وہ معلوم الافیہ مجہول کیفیت پہنچتی ہے۔ یہ مقام
جو بحر عقل کے احاطہ سے خارج ہے، اور جسے اس کی غیر میں ہر قسم کے اشتعال
استمال کے ہوتے ہیں

اس سلسلہ میں فقیر کو بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ جن کے دلوں میں کثرت
میں وحدت کی وہ کاشوق فوارست کی طرح جوش زن ہوتا ہے، تو
اُن کی نظریں میں وحدت تک پہنچتی ہیں، وہ نفس علیہ، وحدت کے
بجز کوئی دوسری وحدت نہیں ہوتی۔ لیکن جب چشم بصیرت، ذات الہی
کو اپنا مطلع نظر بنائے تو یہ توحید ذاتی کی کیفیت ہے۔ تو یہ ذاتی کے
مسمو یہ ہیں کہ ذات حق کو برہنیت اور ہر چیز سے الگ لگے صرف حق میں
دیکھا جائے۔ باقی ذات الہی اور نفس علیہ میں جو نسبت ہے، اسے
اہم القیاسات کا نام دیا گیا ہے۔ اور ان دونوں کے باہمی علاقے کو

کسی خاص نسبت سے متعین کرنا ایک طرح کی زیادتی ہے۔

ذات الہی اور نفس کلیہ کے درمیان جو علاقہ ہے، اس کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے یہاں ایک مثال دی جاتی ہے۔ ذات الہی اور نفس کلیہ میں وہی نسبت ہے جو چار کے عدد اور جوڑے میں ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم چار کے عدد کو اس کے صلی مرتبے میں جہاں وہ یکثرت چار کے نبات خود قائم ہے، دیکھتے ہیں تو سو اے چار کے وہاں اور کوئی چیز نظر نہیں آتی لیکن اس کے بعد جب اس کو خاص چار کے عدد یا مرتبہ سے پیچھے دیکھا جاتا ہے۔ اور گویا اس مرتبہ میں باہر سے کوئی اور چیز اس میں ضم نہیں ہوتی تو یہ چار ہیں دو جوڑے نظر آتے ہیں۔ ہر سال اس قدر چار کے عدد کے دو مرتبے ہوتے۔ ایک خاص چار کا مرتبہ، اور دوسرا دو اور دو چار کا مرتبہ۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ دو اور دو نام ہے اس حقیقت کا جو چار ہے، تو اس شخص کی یہ بات بے جا نہ ہوگی۔ اور فرض کیا اگر وہ دو اور دو کو "چار" کا عنوان بتائے تو یہ چیز بھی ممکن ہے۔ اب اگر اس مرتبہ سے ایک درجہ نظر اور پیچھے آکرے اور وہ چار کو اس مرتبہ میں دیکھے جہاں چار کا خاص عدد چار کے نام سے مخلوط ہو تو بیشک اس نام کو جو کہ چار کے عدد پر دلالت کرتا ہے، نہ چار کی صفت کہیں گے۔ اور اگر نظر اس سے بھی ایک درجہ اور پیچھے آکرے اور وہ دیکھے کہ کس طرح "چار ہونا" یعنی چار کے عدد کی صفت اپنے وجود کے لئے موصوف یعنی چار کے عدد کی محتاج ہے۔ اور نیز

اس موصوف کا صفت سے مقدم ہونا اور پھر اس موصوف کا صرف اپنی صفت ہی کے ذریعے سے قیام پذیر ہونا نظر کے سامنے آجائے اس وقت ہم چار کے عدد کو مبدع یا باعول یعنی ابداع کر بوالہ۔ دوسرے مخلوق میں بنانے والا کہیں گے۔ اور دو اور دو یعنی جفت کو چار کے عدد کا مبدع اور محول یعنی پیدا کر دہ قرار دیں گے۔ اور اگر ہم چار کے عدد کو عام اور مطلق اور جفت کو خاص اور مقید مانیں۔ اور اس ضمن میں دو نو میں تناقض اور تضاد کا خیال صحیح میں نہ لائیں تو اس صورت میں جفت چار کے عدد کا ایک نصیب اور منظر ہو گا۔ الغرض نفس کلیہ اور ذات الہی کے درمیان ایک ایسی نسبت ہے جو مبسوط ہونے کی وجہ سے ان تمام اقاب اور ناموں سے موسوم ہو سکتی ہے۔ آپ جس جہت سے اس نسبت کو دیکھیں گے، اسی اعتبار سے آپ اس کو نام دیں گے۔ چنانچہ ذات الہی اور نفس کلیہ میں جو نسبت ہے، اس کو مختلف ناموں اور اقاب سے تعبیر کرنے کا باعث دراصل اس نسبت کو مختلف جہتوں سے دیکھنا ہے۔ اب جو لوگ وحدت وجود کے قائل ہیں۔ اگر اس سے ان کی مراد نفس کلیہ کی وحدت ہے تو ان کی یہ بات درست ہوگی اور جو تنزیہ ذات کو مانتے ہیں اگر ان کے اس قول کو نفس کلیہ سے اوپر جو ذات الہی کے مراتب ہیں، ان پر اطلاق کیا جائے، تو یہ بڑی مناسب بات ہوگی۔ نفس کلیہ اور ذات الہی میں جو نسبت ہے، سالک کو پائیے کہ

اس نسبت کو اُس نسبت کے ساتھ جو افرادِ اختیار و فرضِ کلیہ کے درمیان ہے، غلط لکھ نہ ہونے دے۔ ورنہ اس کی حالت اس شخص کی سی ہو جائے گی جس نے کہ سبز یا سرخ فیضِ آنکھ پر لگا لیا۔ اور وہ ہر چیز کو سبز اور سرخ دیکھنے لگا۔ اور اس طرح فیضِ کارنگ اس چیز کے رنگ سے جس کو وہ فیضِ میں سے دیکھ رہا ہے غلط ہو گیا۔ اور وہ اُس چیز کا صحیح رنگ نہ دیکھ سکا۔ سالک کی یہ حالت اس وقت ہوتی ہے، جب کہ وہ صحیح معنوں میں "خانی احوال" نہیں ہوتا، بلکہ سال کے ساتھ اُس کے واضح کی سوج بچار بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر سالک نفسِ کلیہ کا شاہد چشمِ حال سے کرتا ہے تو محال اُسے مظاہر کائنات میں اتحاد و وحدت نظر آئیگی۔ اور اگر وہ ذاتِ الہی کو چشمِ حال سے دیکھتا ہے تو کائنات کا وجود اس کی نظر سے یکسر غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ "نظرِ شامل" رکھتا ہے۔ اور نفسِ کلیہ اور ذاتِ باری دونوں کا شاہد چشمِ حال سے کرتا ہے تو یہ وجود کے ایک منظر کو دوسرے منظر کے حکم سے غلط لکھ نہیں ہونے دیتا۔ اور نفسِ کلیہ اور ذاتِ باری ہر دو کو اپنے شاہد میں جمع کر لیتا، یہ مقام افرادِ کاملین کا ہے۔ باقی ہر شخص کی اپنی اپنی راہ ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "وَلِیْ دَجَّةٍ مَّوْمُوْنًا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ" ہر شخص کا اپنا پارِ رخ ہے جس کی طرف وہ منہ کرتا ہے۔ باقی تم تو نیکوئیوں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرو۔

اب افراد انسانی کو ایسے۔ مگر ان میں طرح طرح کی صورتیں ایک دوسرے سے ملی جلی اور باہم خلط و خلل میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر آپ ان میں کے ایک ایک فرد کو دیکھیں تو ہر فرد پر ایک خاص حکم صادق آتا ہے۔ جس کو عقل سلیم چاہے تو بڑی آسانی سے دریافت کر سکتی ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن پر ایک مرتبہ کے احکام زیادہ واضح طور پر صادق آتے ہیں۔ لیکن دوسروں میں آپ انہی احکام کو سرے سے غائب پائیں گے۔ ان افراد میں سے جن کو بلند اور عمومی وکی شخصیت کے مراتب حاصل ہوتے ہیں۔ وہ فنا کے بقا کے مقامات پر فائز ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مین کو اس مرتبہ کے علوم سے فطری طور پر لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جن لوگوں کو نیچے کے جزوی مراتب سے حصہ ملتا ہے، ان کو انہی جزوی مراتب کے مطابق علم حاصل ہوتا ہے۔ اور انہی مراتب کے مطابق ان پر کوائف و احوال وارد ہوتے ہیں۔

ان امور کی وضاحت کے بعد جو نسبتِ تومید کے لئے بطور ایک مقدمے کے ہیں۔ اب ہم اصل مقصد پر آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ نوع انسانی میں بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو وجود کا حکم زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ یعنی ان کی طبیعت کا اقتضا فطری طور پر کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وہ کائنات کی تمام اشیاء کو اصل وجود میں فنا ہوتے دیکھتے ہیں۔ اور نیز وہ ہر چیز میں اسی وجود کو جاری و ساری دیکھتے ہیں۔ اور وہ محسوس

بھی کرتے ہیں کہ دنیا میں جو چیزیں موجود ہے۔ اس کے موجود ہونے کا تمام تر انحصار ہی وجود پر ہے۔ الغرض یہ لوگ مقام وجود پر غائر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جو کچھ وہ بولتے ہیں، اسی مقام سے بولتے ہیں، اور جو کچھ سمجھتے ہیں، اسی مقام سے سمجھتے ہیں۔ بے شک مظاہر وجود کے جو دوسرے مراتب ہیں، یہ لوگ ان مراتب کے احکام کو ہی جانتے ہیں۔ اور انہیں پہچانتے بھی ہیں۔ لیکن اُن کا یہ احساس علم کہ ایک ہی وجود سب مظاہر اور استیاریں جاری و ساری ہیں۔ اُن کی باقی تمام معلومات اور اُن کے کُل دوسرے رجحانات پر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی وجود کے ہر چیز میں جاری و ساری ہونے کا یہ احساس لحظہ بہ لحظہ اُن کے علم و شعور کے اس خرمین کو جو دوسرے مراتب وجود کے متعلق وہ اپنے ذہنوں میں جمع کرتے ہیں، جلا تا جلا اور انہیں نیا نیا کرتا رہتا ہے۔ گو ضرورت کے وقت ان لوگوں کے ذہنوں میں دوسرے مراتب وجود کے احکام بھی نقش ہو جاتے ہیں لیکن اُن کی طبیعت کا فطری تقاضا رہ رہ کر ابھرتا ہے، اور وہ ان مراتب کے وجود کے احکام کو بجلی کی طرح جلا دیتا ہے۔ چنانچہ اُن کا یہ احساس علم کہ ایک ہی وجود ہر شے میں جاری و ساری ہے اور سر نو پھر ان پر غالب آ جاتا ہے۔

شروع شروع میں تو یہ ہوتا ہے کہ ساک وجود کے ہر شے میں جاری و ساری ہونے کا ادراک کرتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ ادراک

فلک کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ چنانچہ ساکب اس فلک کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ یہ فلک جب اپنے کمال کو پہنچتا ہے، تو اس کے دورِ رخ ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسرا باطنی رخ۔ وجود کے اس علم کا یہ رنگ اور اس کا یہ فلک جب ساکب کے صرف جسم میں جاگزیں ہوتا ہے اور اس کا اثرِ نمہ سے آگے نہیں بڑھتا تو یہ اس کے کمال کا ظاہری رخ ہے۔ اور اس کا باطنی کمال یہ ہے کہ ساکب کے اندر نمہ سے پرے جو نقطہ وجود ہے، وہ نہ صرف خود اپنے تمام اثر و احوال کے ساتھ بیدار ہو، بلکہ اس کے اس نقطے سے بیداری کے اثرات و احکام بھی رونما ہوں، اور نیز ساکب کی نظر سے تعینات کے سب پر دسے اٹھ جائیں۔ راہِ طریقت کے ساکبوں میں سے جو غیر کامل ہوتے ہیں، وہ تو اس ضمن میں صرف ظاہری کمال تک ہی پہنچ پاتے ہیں۔ اور باطنی کمال سے آشنا نہیں ہوتے، مگر اگر وہ درجہ کے اس علم کی صورت کو تو پا لیتے ہیں۔ لیکن اس کے معنی کو نہیں جان سکتے

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص اپنی سوچ بچار میں عارفوں کی تعلیمات و انقیاد پر مبنی ہو گیا کہ تمام مشیاء ایک وجود میں متساوی ہیں۔ اور یہ وجود سب اشیاء میں جاری و ساری بھی ہے۔ اب وہ بار بار اس نتیجہ کو اپنے ذہن میں حاضر کرتا ہے، یہاں تک کہ یہ چیز اس کے اندر ایک فلک کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور وہ اس فلک کے رنگ میں

رنگا جاتا ہے۔ گرائس کا نقطہ وجود بیدار نہیں ہوتا۔ غرضیکہ علم وجود کی یہ ساری کشش اور اس کی دُھن میں سالک کی یہ تمام محویت اُسے اس مرتبہ تک نہ پہنچا سکی جہاں کہ اس علم کا ملک سالک کے اہل نفس اور اس کی جڑ میں جاگزین ہو جاتا۔ اس سالک کی مثال اس تالاب کی سی ہے کہ وہ سیلاب کے پانی سے بھر گیا لیکن اس میں زمین کے مساوات سے پانی نہیں پھرنا۔ سالک کا اس طرح وجود کو ایک امانا توحیدِ علی کہلاتا ہے۔ ماور علم وجود کی پہلی شکل جب کہ یہ علم سالک کے ضمیر سے پردے اس کے اندر جو نقطہ وجود ہے، اُسے بیدار کر دینا ہے۔ اُتو حیدِ مالی کہلاتی ہے۔

فقیر کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہے کہ بعض لوگوں کے لئے توحیدِ علی نفع مند نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سے اُلٹا نہیں نقصان ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بے کار کی دلیل بازی جسے سوسطائیت کہتے ہیں اسی توحیدِ علی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور نیز اسی توحیدِ علی کی وجہ سے ہی لوگ شرعی اور عرفی احکام و ساج میں تباہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ باقی رہا توحیدِ مالی کا معاملہ۔ سو توحیدِ مالی تو ایک بہت بڑا کمال ہے کہ زبانِ اُنس کے مطابق کو ادا کرنے سے عاجز ہے۔ تو اہل فضل انشوریتہ من یشاء۔

نسبتِ عشق

ان نسبتوں میں سے ایک نسبتِ عشق ہے۔ اور اس نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ مومن جب حق سبحانہ کے متعلق یہ یقین کر لے کہ وہی ذاتِ تمام و کمال کی کمال کی حال ہے اور نیز وہ حق سبحانہ کے ذکر کو اپنے لئے دہرِ کمال سمجھے چنانچہ وہ ہمیشہ اس کے مبارک نام کا ذکر کرتا رہے۔ اور وہ حق سبحانہ کی نعمتوں اور بخششوں کو بھی بیشِ نظر رکھے، تو ذکر و فکر میں اس کا برابر اس طرح لگا رہنا اس کے دل میں بے قراری، اضطراب، شوق و تعلق کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس کی حالت روز بروز اس شعر کی صداقت ہوتی جاؤ ہے۔

وہ رکعتی ذکر کا شعر پڑھتا لعلِ امینِ جلدی و اللطامِ ذریب

”جب میں اس کا ذکر کرتا ہوں، تو اس کے ذکر سے مجھ پر کچکا ہٹ سی طاری ہوتی ہے۔ اور اس کا اثر میری ٹہریوں اور میری جلدوں میں سرایت کر جاتا ہے۔“

حق سبحانہ کا ذکر کرتے کرتے آخر کار نسبتِ جہاں تکمیل پہنچتی ہے کہ جب

یہی مومن کی زبان پر اللہ تعالیٰ کا مبارک نام آتا ہے تو اس پر اس طرح کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، گویا کہ ابی روح اس کے بدن سے علیٰ حبثہ کچھ جب یہ کیفیت مومن کے نفس میں متکلم ہو جائے، اور اس کا نفس اسی کیفیت کے رنگ میں کسر رنگین ہو جائے تو اس کیفیت کو نسبت عشق کہتے ہیں۔ ۱۰

افراد کا ایمن کا وہ گروہ جو فنا و بقا کے مقامات پر فائز ہے، ان کے نزدیک اس نسبت عشق کا ایک ظاہر ہے، اور ایک باطن۔ اس نسبت کا ظاہر تو یہ ہے کہ جس طرح نفس کی اور کیفیتیں انسان کے اندر میں اپنی جگہ بنا لیتی ہیں، اسی طرح نسبت عشق بھی اس اندر میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ اور نسبت عشق کا باطن عبارت ہے، اس محبت ذاتی سے جس کا حامل انسان کا نفس مجرد ہوتا ہے، بلکہ یہ محبت ذاتی تو انسان کے اندر روح کے وجود میں آنے سے پہلے ہی پیدا ہو گئی ہوتی ہے۔

اس اجہال کی تفصیل یہ ہے کہ قدرت نے جس طرح مٹی اور پانی میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ ہمیشہ نقیب کی طرف اپنا رجحان رکھتے ہیں، اور ان کے برعکس ہوا اور آگ کا رخ ہمیشہ اوپر کی طرف ہوتا ہے۔ چنانچہ جو جو جہات میں سے ہر ایک چیز میں خواہ وہ چیز محسوسات میں سے ہو یا معقولات میں سے اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی ذاتی کمال ضرور رکھا ہے اور اسی بنا پر ہر چیز اپنے ذاتی کمال کے حصول کے لئے مصلحت بھی رہتی ہے۔ اور جب تک وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر لیتی، وہ برابر جہنم میں اور مضطرب رہتی ہے۔ اور آخر میں جب وہ اپنے فطری کمال کو پا لیتی ہے تو اسے راحت نصیب ہو جاتی

ہے۔ پس یہی خیال مظاہر عالم کی اس کثرت کی ہی ہے۔ کائنات کی یہ ساری کثرت جو کہ ایک وحدت سے ملتی ہے، اس نے اس کثرت کا نظریہ تقاضا یہ کر کر دیا کہ اس وحدت کی طرف ذاتی میلان رکھے۔ اور اس کی طرف اس کی پرواز ہو۔ علاوہ ازیں کائنات کی یہ کثرت جس وجود کے مظاہر میں کر ہے۔ ان مظاہر اور اس ظاہر ہونے والے اصل وجود میں بھی ایک خاص ربط پایا جاتا ہے۔ یہ ربط ان مظاہر میں سے ایک ایک مظہر کی اصل فطرت اور اس کی جبلت میں داخل ہے۔ اس ربط اور میلان سے مقصود نفس یا بہت کی وہ حالت یا کیفیت نہیں جو کوشش اور ریاضت کے بعد کہیں حاصل ہوتی ہے۔ اور نہ یہ ربط اور میلان نتیجہ ہے اس ذکر و فکر کا، جو ایک شخص اذ قسانے کی نعمتوں اور محسوسات کے متعلق کرتا ہے۔ بلکہ یہ ربط کسی خارجی کوشش کا صلہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ہر چیز کی اصل فطرت اور اس کی جبلت میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی کو محبت ذاتی کہتے ہیں۔

اب یوں ہوتا ہے کہ نفس کی اور کیفیات کی طرح مومن کے ضمہ میں بہت عشق جاگزیں ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں محبت ذاتی بھی شامل ہوتی ہے۔ اور اس طرح دونوں کے ملنے سے وہاں ایک مرکب سامنے جاتا ہے۔ اس مرکب کا ہم تو قسمہ کی یہ کیفیت عشق ہوتی ہے۔ اور اس ترکیب کی روح محبت ذاتی بن جاتی ہے۔ لیکن جس شخص پر یہ احوال و کوائف وارد ہوتے ہیں، وہاں وہ دونوں کوئی فرق نہیں کر پاتا۔ پھر مثال اگر قسمہ کی اس کیفیت اور محبت ذاتی کا فرق مجھ میں آجائے۔ تو پھر صوفیاء کے ان دو متضاد

اقوال میں مطابقت کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ سو فی الواقع ایک گروہ کہتا ہے کہ خلق واضطراب
ایک عذاب ہے، جسے محبوب کا عمل نصیب ہو گیا، اُسے پھر یہ عذاب کیوں دیا جاتا
تھا، اور دوسرے گروہ کا قول یہ ہے کہ عشق، خلق اور اضطراب ایسی کیفیات ہیں
کہ نہ سالک کو یہ اس دنیا میں چھٹیں گی، اور نہ دوسری دنیا میں یہ کیفیات اس پر
دور ہوں گی۔ بات یہ ہے کہ پہلا گروہ یہ کہتا ہے کہ دھالی محبوب کے بعد
خلق و اضطراب کیسے باقی رہے گا؟ تو اس سے دراصل اس کا مطلب نسخہ کا
خلق و اضطراب ہوتا ہے، کیونکہ دھالی کے بعد نسخہ میں خلق و اضطراب کا رہنا
تصور میں نہیں آسکتا۔ اور دوسرا گروہ جب کہتا ہے کہ نہ صرف اس دنیا میں بلکہ
دوسری دنیا میں بھی خلق و اضطراب کی کیفیت برقرار رہے گی تو اس سے اُن
کی مراد محبت ذاتی ہوتی ہے، لیکن اس ضمن میں صورتِ حال یہ ہے کہ اکثر
عارفوں کو نسخہ اور محبت ذاتی باہم مخلوط نظر آنے میں! اور وہ ایک کو دوسرے
سے الگ نہیں کر سکتے، چنانچہ اسی بنا پر جب وہ اصل حقیقت کی تعبیر کرنے لگتے
ہیں، تو وہ ٹھیک طرح اس کی وضاحت نہیں کر پاتے۔

اس مقام پر دو نکاتوں کا کچھ ضروری ہے، ایک یہ کہ اگر کسی عارف میں
محبت ذاتی کم ہو جائے، خواہ یہ کسی اس وجہ سے ہو کہ اس نے ذاتِ حق کے
وجود کو تمام اشیاء میں جاری و ساری دیکھا، اور اس سے اس کے دل میں وہ
اضطراب و شوق نہ رہا، جو محبوب کی دوری سے پیدا ہوتا ہے، پھر حالِ محبت
ذاتی کی کمی کی کوئی بھی وجہ ہو، یہی عارف کے حق میں نقصان کا باعث ہوتی
ہے، خواہ یہ عارف کسی مرتبہ کمال ہی پر کیوں نہ فائز ہو، اور دوسرا نکتہ یہ ہے

کے متعاقب مزاج اور وفور عقل کے ہوتے ہوئے کسی شخص کا دنیا و آخرت کو ترک کر دینا، اور اس سے تجرد اختیار کر لینا، اور نیرال و عیال کی فکر سے درگزر کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ نسبتِ عشق کی کیفیت اس شخص کے سر میں موخر نہ ہو، جس شخص کو یہ نسبت حاصل ہوتی ہے، وہ تمام ماسویٰ اثر پر پورا قابو پالیتا ہے۔ اور ان سب چیزوں سے جو ماسویٰ اثر کے حکم میں آتی ہیں، وہ کلیتہً اعراض بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے عشق رکھنے والے عارف کی خانہ بدوشی ہے کہ جو بھی اُسے دیکھتا ہے، اُس سے عجز و فروتنی سے پیش آتا ہے۔

نسبتِ وجد

ان نسبتوں میں سے ایک نسبتِ وجد کی ہے۔ نسبتِ وجد کی حقیقت سمجھنے سے پہلے نفسِ ناطقہ کے متعلق اتنا جاننا ضروری ہے کہ یہ اپنی فطرت میں کچھ اس طرح واقع ہوا ہے کہ جو جمالات اس پر گزرتے ہیں، یہ اُن جمالات کا رنگ قبول کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر محبت و غمّتِ عشق و فتنہ و خانہ جنگی اور خوف و طمانیت کی کیفیات کو لیجئے۔ اُن میں سے بعض کیفیات تو پاک اور نیکلی ہیں۔ اور بعض مایاک اور حیوانی و بہیمی۔ جب ان میں سے کوئی کیفیت نفسِ ناطقہ پر موثر ہوتی ہے تو اس سے دوسری کیفیت جو اس کی ضد ہو، نفسِ ناطقہ سے از خود زائل ہو جاتی ہے۔

انسان کی یہ نفسی کیفیات مختلف جمالات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ان جمالات کے اپنے اسباب ہوتے ہیں۔ جب سناک اُن اسباب پر دستِ حاکم حاصل کرے، جو نیکلی اور الہی جمالات کو پیدا کرتے اور اُن کو تقویت

بہشتے ہیں تو احوال اس سے اس کے نفس ناطقہ میں اسی قبیل کی کیفیات کی استعداد بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں اس کا نفس ناطقہ اتنا حساس ہو جاتا ہے کہ ایک ذرا سی تحریک جسے عرف عام میں ہم کسی سواپ میں نہیں آتے، اس کے اندر غیر معمولی تاخیر پیدا کر دیتی ہے۔

الغرض میں شخص کا نفس ناطقہ کلی اور الہی مؤثرات کو قبول کرنے میں اس قدر حساس ہو، اس کے لئے ادنیٰ سا محرک بھی بڑی تاخیر رکھتا ہے لیکن جو شخص کند ذہن اور جاہل طبیعت کا ہو، اس کے نفس ناطقہ میں کسی ایسی کیفیت کا پیدا ہونا جو بے مدلیط ہو، مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس شخص کو اپنے اندر اس قسم کی کیفیات پیدا کرنے کے لئے کسی سے عشق و محبت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عشق و محبت پاک ہو، اور اس میں شہوانیت کا دخل نہ ہو یہ شخص جب اپنے محبوب کو آتا جاتا دیکھتا ہے، تو محبوب کی موزوں اور متناسب چال و حال اور اس کی رنگیں عبارتیں اس پر بڑا اثر کرتی ہیں، اس شخص کو محبوب کے وصال سے راحت، اور اس کے فراق سے دھڑکت ہوئی ہے۔ اور جب محبوب اس کی طرف التفات کرے تو اس کے دل کی کمی کھل جاتی ہے۔ اور جب وہ اس سے بے التفاتی رہنے کو وہ مجبوراً سا ہو جاتا ہے۔ غرض کہ عشق و محبت کے سلسلہ میں اس شخص کو اس طرح یا ان سے ملنے جلتے اور احوال و معاملات سے سابقہ پڑتا ہے۔

نفس ناطقہ میں لطیف کیفیات پیدا کرنے کے لئے کند ذہن اور

جامد طبیعت والے کو سماع کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اور بہتر یہ ہے کہ سماع میں زمین، اشعار ہوں۔ اور وہ نغمے اور زیر و بم کے ساتھ گائے بھی جائیں۔ اور خاص طور پر وہ اشعار زیادہ موثر ہوتے ہیں، جن میں اچھے استعارے ہوں۔ اور ان کے قافیے بہت عمدہ ہوں اور ان کا اسلوب بیان بڑا وجد آور ہو۔

پہراہِ مینرند میں مطرب مقامِ شاک کہ در میان غزلِ قولِ آشتا آورد
اس شخص میں اس شخص کے لئے رباب اور طنبورے کی موسیقی بھی مفید ہے
کیونکہ موسیقی سرور و ہستی پیدا کرنے میں وہی تاثیر رکھتی ہے۔ جو تاثیر کہ شراب میں ہوتی ہے۔

الغرض عشقِ پاک باز ہو، یا سماعِ شعر و نغمہ، اگر کندِ ذہن اور جامدِ طبیعت والا بہرہبران سے منع ہوتا رہے تو درحقیقت اس کے نفسِ ناطق میں اس سے ایک نہایت کیفیت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس کا نفسِ ناطق ان کیفیات سے متصف ہوتا جاتا ہے، چنانچہ اس طرح کندِ ذہن آدمی کی طبیعت کا جمود ٹوٹ جاتا ہے۔

نفسِ ناطقہ کو متاثر کرنے کا جو طریقہ اچھا بیان ہوا، اربابِ وجد میں سے اکثر لوگ اس کی طرف راغب نظر آتے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں شایع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وجد کے ظاہیوں کے لئے جو راہ تجویز فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی فقط نغمے، قرآن کی تلاوت کرے، اور ساتھ ساتھ اس کے معانی پر غور کرے۔ دورانِ تلاوت میں جہاں جہاں

اشرقائے کی بخشش و رحمت کا ذکر آئے، وہاں وہ اُس سے رحمت چاہے۔ اور جہاں عذاب کا ذکر ہے، وہاں اُس کے عذاب سے پناہ مانگے۔ اور جن آیات میں صفات الہی کا بیان ہے، اُن کی تلاوت کرتے وقت خدا تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل کرے۔ اس کے علاوہ رقت پیدا کرنے والی احادیث اور حکایات کو پڑھے، اور اُن کے مطالب کو اپنے ذہن میں بار بار دہرائے۔

طبیعت کے جہود کو دُور کرنے اور نفسِ نالائق کو متاثر کرنے کے صرف یہی طریقے نہیں ہیں۔ جو اوپر بیان ہوئے۔ بلکہ بعض دفعہ دریا کے جوش و خروش اور صحرا اور سمندر کی بے کنار وسعت کو دیکھ کر یا دل میں کسی خیال کے آنے سے جو کسی کیفیت کی یاد تازہ کر دیتا ہے، انسان پر یہ حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح بعض لطیف مضامین گننے سے بھی انسان کو وجد آ جاتا ہے۔

اہل کمال کے نزدیک نسبت و جد کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ نسبت و جد کے ظاہر سے مراد وجد کی کیفیت کا صرف ظہر میں جاگزیں ہونا ہے۔ اور اس کے باطن کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کا لطیف مجروحہ یعنی اس کی روح ایک معرفت کے بعد دوسری معرفت حاصل کرے۔ اور خدا تعالیٰ کے ایک اہم میں فنا ہونے کے بعد وہ اس کے دوسرے اہم میں فنا ہو۔ خواجہ نقشبند نے اس کا نام قبض و بسط رکھا ہے۔

غلامہ مطلب یہ کہ جن لوگوں کو یہ نسبت حاصل ہوتی ہے، اُن میں سے اکثر سامع و وجد پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ اور اُن میں سے جو فنا و بقا کے مقام پر سرفراز ہوتے ہیں، اُن پر نسبت وجد کی وجہ سے ایسے حقائق و معارف کا فیضان ہوتا ہے کہ زبان ان کو ادا کرنے سے قاصر ہے۔

صوفیائے کرام کے طبقات اور انکی نسبتیں

(۱) اس فیض کو بتایا گیا ہے کہ صحابہ، تابعین اور مجاہدین کی نسبت احسان ہے۔ نسبت احسان مرتب ہے نسبت طہارت اور نسبت عکینہ کو۔ اور اسی کے ساتھ عدالت، تقویٰ اور رسالت یعنی حسن اخلاق کے انوار اور اس کی برکتیں بھی شامل ہیں۔ چنانچہ ان بزرگوں کے کلام کا اصلی مفہوم ان کے ارشادات کا صحیح مفہوم اسی نسبت احسان پر دلالت کرتا ہے۔

میں نے علامہ اہل بیت کی ارواح کو دیکھا کہ وہ عالم ارواح میں ایک دوسرے کا رامن مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اور حقیر و القدس میں ان کی بڑی منزلت حاصل ہے۔ اور میں نے وہاں یہ بھی مشاہدہ کیا کہ اہل بیت کی ارواح کی قوت خارج سے زیادہ عالم ارواح کے باطن میں ہے۔

(۲) وہ صوفیائے متقدمین جن کا ذکر طبقات علی اور رسالہ تفسیری میں

لے دئے دوسرے صفحہ پر کیئے۔

ہے، ان کی مختلف نسبتیں ہیں۔ ان میں سے بعض بزرگ نسبتِ احسان رکھتے ہیں۔ اور بعض نسبتِ عشق و وجد۔ اور ان میں سے ایک جماعت نسبتِ تجر و رکھتی ہے۔ اور ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے، جن میں کا ہر شخص ان نسبتوں میں سے ایک نہ ایک نسبت اس طرح رکھتا ہے کہ وہ نسبت، نسبتِ یادداشت سے ٹلی ہوئی ہے۔ ان سب نسبتوں کا باب لباب ہم اس کتاب کے شروع میں بیان کر آئے ہیں۔

(۳) حضرت غوث اعظم نسبتِ اویسی رکھتے ہیں۔ اور ان کی اس نسبت کے ساتھ نسبتِ یکنہ کی برکات بھی ٹلی ہوئی ہیں۔ حضرت غوث اعظم کی اس نسبت کی تفصیل یہ ہے کہ شخص اکبر کے دل پر ذات الہی کی تجلی ہوئی، اور یہ تجلی نورِ نبی باری قلمائے کی ذات کا۔ جس شخص کو یہ نسبت مل جاتی

لے ابو عبد الرحمن محمد بن حسین بن محمد بن موسیٰ علی بنشاپور کے مشہور صوفی تھے، موصوف کو صوفیاء کے معانی و اخبار سے بڑی دلچسپی تھی، آپ نے تصوف کے نقطہ نظر سے سنن، تفسیر اور تاریخ میں کتابیں لکھیں آپ کی اپنے صلفِ صوفیاء میں بڑی عزت تھی۔ موصوف نے سلاطین میں انتقال فرمایا۔

۲۔ ابو القاسم عبد کریم بن ہود بن عبد اللہ القشیری آپ بھی بنشاپور کے رہنے والے تھے سلاطین میں بغداد میں تھے۔ موصوف تفسیر، حدیث، فقہ، حکم، اصول، حدیث، نجومی، دانش پر دار، شاعر، صوفی، اپنے زمانے کی زبان اور اپنے عہد کے سرور تھے۔ آپ کی تفسیر بہترین اور جامع ترین تفسیروں میں سے ہے۔ تصوف میں آپ کا ایک رسالہ "املا القشیریہ" کے نام سے مشہور ہے۔

ہے۔ وہ شخص اکبر کے اس نقطہ تخیلی کا محبوب و مقصود بن جاتا ہے۔ اب چونکہ نفوس انھلاک، طار اسنے اور ارواح کا ملین کی محبت شخص اکبر کے اسی نقطے کے ضمن میں آتی ہے، اس لئے یہ نسبت رکھنے والا شخص اکبر کے نقطہ تخیلی کی وسالت سے سب کا محبوب و مقصود بن جاتا ہے۔ الغرض جب اس نسبت کا ماحول شخص اکبر کی اس تخیلی کا محبوب غیر تو اس محبوبیت کی وجہ سے اس کے تجلیات الہی میں سے ایک تخیلی کا فیضان ہوا۔ اور یہ تخیلی جامع ہوتی ہے قدرت الہی کے ان چار کمالات یعنی ابداع، خلق، تدبیر اور تہلی کی جو اس نظام کائنات میں مصروف عمل ہیں۔ چنانچہ اس تخیلی کی تخیلی اس نسبت رکھنے والے شخص سے بے انتہا خیر و برکت کا ظہور ہوتا ہے۔ خواہ وہ اس نظام کمال کا قصد کرے یا نہ کرے۔ اور اس فیض کی طرف اس کی توجہ ہو یا نہ ہو۔ گویا کہ اس شخص سے خیر و برکت کا یہ صدور ایک نئے شدہ امر ہے۔ اور یہ اس کے ارادے کے بغیر ہی معرض وجود میں آ رہا ہے۔

حضرت غوث اعظم کی زبان سے خیر اور بڑائی کے جو ابتدا جنگ کلمات نکلے۔ اور آپ کی ذات گرامی سے تسخیر عالم کے جو واقعات رونما ہوئے یہ سب کچھ آپ کی اسی نسبت کا نتیجہ تھا۔ اس ضمن میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب یہ نسبت تکمیل کو پہنچتی ہے تو اس کی وجہ سے کسی نسب نسبت یا رفاقت بھی جو نسبت قومیت سے ملی ہوئی ہوتی ہے، حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ سب نسبتیں جن کا کہ اوپر بیان ہوا۔ ان کے آثار بھی کہ ان نسبت والوں کے اپنے احوال و طبائش ہوتے ہیں، انہی کے

مطابق ہی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

(۴) خواجہ نقشبند کی اصل نسبت نسبت یادداشت ہے ۱۰ اور حشر ایسا ہوا ہے کہ یہ نسبت احسان کی نسبت تک پہنچا دیتی ہے چنانچہ اسی بنا پر خواجہ نقشبند کا یہ ارشاد وارد ہوا ہے کہ ”مسلمانی اور طاعت“ انقیاد سراسر اپنا نور و صفات ہیں۔“

(۵) خواجگانِ چشت میں سے مشائخِ متقدمین کو نور و طہارت و سکینہ کی نسبت جو نسبت عشق سے ملی ہوئی ہے، حاصل تھی ۱۰ اور جو دورِ متوسط کے مشائخ ہیں، اُن کی نسبت، نسبت عشق تھی، جس میں کو نور و سکینہ کی نسبت کی آمیزش تھی۔ اور ان بزرگوں کی نسبت میں خاص طور پر اسمائے الہیہ کے انوار اور ان کی برکات کا بڑا اثر تھا ۱۰ اور خواجگانِ چشت میں جو آخری دور کے مشائخ ہیں، ان کی نسبت عشق جس میں کسی قدر نسبتِ توحید بھی ملی ہوئی تھی، حاصل تھی۔

(۶) سہروردی طریقے کے بزرگوں کی نسبت نور و طہارت اور نور سکینہ کی تھی۔ اور اُن کی اس نسبت کے ساتھ نسبتِ یادداشت بھی شامل تھی۔

(۷) سلسلہ اکبرہ کے مشائخ کی نسبت توحید تھی، جس میں کہ بعض کے نزدیک تو عشق و وجد کی نسبت بھی ہوئی تھی۔ اور دوسروں کے خیال میں ان مشائخ کی اس نسبتِ توحید کے ساتھ ساتھ نور سکینہ کی آمیزش تھی۔

۸) طبقہ کبروہ کی نسبت ایک سی نظر نہیں آتی۔ مقدمین میں اس نسبت کی کیفیت اور تخی اور متاخرین میں کچھ اور۔

۹) طریقہ شانازی کی نسبت کی تفصیل یہ ہے کہ وہ نقطہ جو شخص اکبر کے قلب میں ہے۔ اور وہ فونہ ہے باری تعالیٰ کی ذات کا۔ اس نسبت کی وجہ سے ساک کا نفس ناظمہ اس نقطے کی مثالی صورت سے اور نیز اس کے ارد گرد مدار اپنے کے جو فیوض پھیلے ہوئے ہیں، اُن سے اتصال پیدا کر لیتا ہے۔ اور اس اتصال کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ ساک کو اس تدبیر پر پورا پورا اعتماد حاصل ہو جاتا ہے، جو انسان کو مدارج قرب الہی تک پہنچانے میں برابر مصروف کار ہے اور جسے تدلی کا نام دیا گیا ہے اس تدلی سے ”نا کوئی محمد الذی یسبح“ بھرہ اندی بصرہ کی نسبت یعنی یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اُس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے

لے طریقہ امام ابی الحسن علی بن عبادہ شانازی کی طرف منسوب ہے۔ شانازہ شمالی اتر چتر میں ایک گاؤں تھا جہاں موصوف پیدا ہوئے۔ تاجیٹے ہوئے کے باوجود آپ نے علوم شرعی میں بڑا درجہ حاصل کیا، اور پھر موصوف تصوف کی راہ پر بھی گامزن ہوئے اور اس میں بڑا نام پیدا کیا۔ پہنچنے سے اسکندریہ میں منتقل ہوئے تھے۔ پہنچے ۳۵۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ابن دقین العید کہتے ہیں کہ میں نے اُن کی قبر کو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی سرفرازی رکھنے والا نہیں پایا، بلکہ اس کے باوجود اہل غریب نے انہیں بخش دیے۔ اور اپنے اہل سے نکال دیا اور اسکندریہ کے حاکم کو لکھا کہ تمہارے اہل ایک غریبی ذوقی آدمی ہیں جو تم نے اپنے شہر سے نکال دیا ہے لیکن اس کے باوجود انہیں اسکندریہ میں پناہ مل گئی۔

وہ سُنتا ہے ، اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں ، جس سے وہ دیکھتا ہے ،
 ساک کے اندر پیدا ہو جاتی ہے ۔ قرآن مجید کی اس آیت ”ان یؤی اشہ
 الذی نزل الکتاب“ وہ یوئولی الصالحین میں اسی نسبت کی طرف اشارہ
 ہے ۔ باقی اشہ ان امور کو بہتر جانتا ہے ۔

مزید برآں یہ بھی یاد رہے کہ ان سب طریقوں کی نسبتیں ہمیشہ ایک
 طریق پر وقوع پذیر نہیں ہوتیں ۔ اس معاملہ میں سالکوں کی اپنی کوشش اور
 دھماں کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے ۔ ہر حال جیسے کسی سالک کی کوشش درجہ اعلیٰ
 ہوتا ہے ۔ اُنہی کے مطابق اُسے کسی نسبت کے حصول کی استعداد ملتی
 ہے ۔ مزید برآں ایک خاص نسبت کے آثار کی تحقیق صرف اُنہی وقت
 ممکن ہو سکتی ہے ۔ جب کہ یہ نسبتیں بالکل خالص ہوتیں ۔ اور ایک نسبت
 میں دوسری نسبت کی آمیزش نہ ہوتی ۔ یہ خصوصیت متاخرین کے ہاں
 پوشاؤ و نادر ہی پائی جاتی ہے ۔ علاوہ ازیں ہر نسبت کے جدا جدا
 ثمرات کی تحقیق اُس وقت ہی ممکن ہو سکتی تھی ، جب کہ سالک آئندہ
 نسبت سے اُن کی مخصوص نسبت کو بغیر کسی تبدیلی و تغیر کے پتے
 اور اس طرح نہ ہوتا کہ مثلاً آخرت یا بیعت کے ذریعہ انہوں نے ایک
 نسبت درست کی ۔ اور ریاضت و مجاہدہ سے دوسری نسبت حاصل
 لی ۔ اور یہ بات بہت سے لوگوں میں جو تصوف کے طریقوں کی فکر
 سبب ہیں ، عام طور پر پائی جاتی ہے ۔

انغرض اگر تصوف کے ان مختلف طرق کی نسبتوں اور ان کی خصوصیات

پر نظر ہو تو ایک ذہین آدمی بڑی آسانی سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ خواہر
 نقشبند قبروں کی باقاعدہ زیارت کو کیوں قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ اور ان
 کے نزدیک وہ واقعات اور معاملات جو سانگ سے اس کی طامات کی
 قبولیت سے قبل ظاہر ہوتے ہیں، کس بنا پر درخور اعتبار نہیں ہیں! وہ
 نیز وہ یہ بھی جان لے گا کہ حقیقی طریقے کے بزرگ سماع کی طرف کیوں اتنی
 رغبت رکھتے ہیں۔ ان باتوں کو سمجھنے کے لئے تمہیں غور و تدبر کرنا چاہیے۔
 اس بغیر کہ بتایا گیا ہے کہ حضرت غوث اعظم کے طریقے کی مثال ایک
 ایسی ندی کی ہے کہ کچھ دور تو وہ زمین کی سطح کے اوپر اوپر بہتی رہی۔ پھر
 وہ زمین کے اندر غائب ہو گئی۔ اور اندر ہی اندر دور تک بہا کی۔ اور
 اُس نے زمین کے اندر دنی مسامات کو فنا کر دیا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ
 چشمہ کی شکل میں پھوٹ نکلی۔ اور پھر دور تک زمین کی سطح کے اوپر اوپر
 بہتی چلی گئی۔ الغرض اس کا زمین کی سطح پر ظاہر ہونے اور پھر زیر سطح غائب
 ہونے کا سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہا۔ بعینہ ہی حال طریقہ مہمانیہ کا۔
 گو اس طریقہ کا سلسلہ فرقہ تو مسلسل ہوا آ رہا ہے۔ لیکن اخذ نسبت کا
 سلسلہ اس طریقے میں متصل نہیں رہا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ایک بار
 طریقہ رونما ہوا۔ اور اس کے بعد مفقود ہو گیا۔ اور پھر دوبارہ بطریق
 بغیر کسی مرشد کے توسط سے اس طریق کا کسی بزرگ کے ہاتھ سے ظہور
 اور پہنچ پوچھے تو یہ طریقہ مہمانیہ تمام قرا و سید ہی ہے۔ اور اس طرح
 سے انتخاب رکھنے والے بزرگ بڑی رغبت اور سطوت کے مالک

بانی رابطہ طریق نقشبندیہ، تو وہ بمنزلہ اس ندی کے ہے، جو برابر سطح زمین کے اوپر اوپر بہتی چلی جائے۔ جو بزرگ اس طریقے سے متنبہ ہوتا ہے، اس کی ذات اس عالمِ ناسوت میں خدا تعالیٰ کے قوی اور مقتدر اسلحہ کی منظر ہوتی ہے۔ مختصر طریق نقشبندیہ کی مثال ہوں مجھے کہ جیسے کوئی فحاش کسی دیوار پر خوشنامہ نقوش بنا دیتا ہے۔ اور طریقہ جیلانیہ کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص آئینے کو صاف اور بھلا کرتا ہے، تاکہ باہر سے اس پر خوشنامہ نقوش کا عکس پڑ سکے۔ یا جیسے کوئی کموار کو اس طرح صیقل کرے کہ اس کا اصلی جوہر نمایاں ہو جائے۔ چنانچہ جس شخص کو طریقہ جیلانیہ کی نسبت حاصل ہوتی ہے، وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ جو کچھ اُس پر باہر سے عکس پڑ رہا ہے، یہ کمال دراصل اس کی خود اپنی فطرت میں موجود ہے۔ اور یہ اُسے بغیر کسی محنت اور ریاضت کے حاصل ہو گیا ہے۔ طریقہ چشتیہ مقبولوں کا طریقہ ہے، اس طریقے کے متوسلین عوامِ انساں میں بڑے مقبول ہوتے ہیں۔ اور نیز صوفیاء میں سے مہشتی بزرگ عام لوگوں سے زیادہ مشاہیر ہوتے ہیں۔ بانی جو اصل حقیقت ہے، وہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

اب رہا فقیر کا طریقہ :- جب فقیر نے جذب کی راہ طے کر لی تو تو اُس کے سامنے ان تمام اکابر کی طرف ایک کنارہ رات کھل گیا۔ اور اُس نے اوپر کی یہ ساتوں کی ساتوں بستیاں بطریقِ ذوقِ دو جہاں اور بواسطہ بحث و نظر معلوم کیں۔ اور ان میں خوب تحقیق بھی کی۔

چنانچہ اس فقیر کو جو نسبت عطا کی گئی ہے، وہ انہی سات نسبتوں سے مرکب ہے۔ اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب میں خود اپنے آپ میں ہوتا ہوں تو مجھ پر ایک ایسی اجمالی صورت ظاہر ہوتی ہے، جو ان ساتوں نسبتوں کا خلاصہ ہے۔ اور جب میں اپنے آپ کو ان نسبتوں میں سے کسی ایک کے سپرد کر دیتا ہوں، اور اس کی طرف پوری طرح اپنے دل کو متوجہ کر لیتا ہوں، تو مجھے خاص اس نسبت میں استغراق حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان دو حالتوں میں سے جہاں تک پہلی حالت کا تعلق ہے، اس میں مجھ پر ان سات نسبتوں میں سے ہر نسبت کے آثار اجمالی طور پر، اور ایک دوسرے سے ملے جملے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور دوسری حالت میں جب کہ میں صرف ایک نسبت کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تو خاص اس نسبت کے آثار بڑی تفصیل سے اور اچھوتہ حیثیت میں مجھ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ بہر حال ان تمام نسبتوں میں اور خاص طور پر ان میں اجمالی لحاظ سے مجھے بڑا رسوخ اور ثبات عطا کیا گیا ہے۔

دورانِ لی فی کل نسبت شعرة سالکاً استوفیت وجہ حمد
 اگر میرے ہر ذرات کی جڑ زبان بن جائے اور میں اس کی حمد بیان کرنے لگوں
 تو پھر میں بھی اس کی حمد کا حق ادا نہیں کر سکوں گا۔
 اب اگر کوئی شخص ہماری نسبت کا طالب ہے تو سب سے پہلے
 اُسے یہ کرنا چاہیے کہ وہ راہِ جذب کو تا آخر تمام کرے۔ لیکن یہ چیز

غالباً کسی مہذب کے فیض تربیت کے بغیر میسر نہیں آتی۔ اس کے لئے
 سالک کو چاہیے کہ وہ کسی مہذب کے زیرِ ملاحظت، اس کی بڑا شیرِ نصرت
 کی مدد سے اس مرحلہ کو طے کرے۔ یاد رہے کہ اس معاملہ کا تعلق تقسیم
 و تعلم اور گفت و شنود سے زیادہ نہیں۔ جب سالک راہِ جذب کو
 تمام کرے تو پھر اوپر کی ان سات نسبتوں میں سے ایک ایک کو اعلیٰ درجہ
 اعلیٰ درجہ حاصل کرے۔ اور ہر ایک سے فرداً فرداً اپنا ربط پیدا کرے۔
 یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب وہ مراتب میں جانے تو سب سے پہلے ہمارے
 ہیکل، اور اویسیہ کی نسبتوں کی طرف متوجہ ہو۔ اور جب اس کی
 چشمِ بصیرت ان نسبتوں کو دیکھنے لگے تو سالک ان نسبتوں کو ہاتھ اور
 ان کے رنگ میں رنگے جانے کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھے۔ اور
 نسبتِ یادداشت کو اپنا طبعِ نظر بنائے۔ اور کوشش کرے کہ اس
 کا اپنا نقطہ وجود یعنی وہ اصل حقیقت جس سے خود اس کی اپنی ذات
 عبارت ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کا "انا" باری تعالیٰ کی طرف
 جو تمام وجودوں کا سرچشمہ یعنی وجودِ خالص ہے، منکمل ہو۔ اور اس امر
 میں وہ پوری طرح کو شاں رہے۔ یہی لبِ لباب ہے توحید کا۔ اور
 یہی مقصود ہے عشق سے۔

جب سالک تخیل کی یہ منزل طے کرے گا تو اجمالِ اس کے اندر
 حقیقتِ وحدہ برونے کا رہائے گی۔ کیونکہ یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے اس
 نسبت کا، الغرض جن طرقِ تصوف کے متعلق ہم نے ابجد کے کلام

میں اشارہ کیا تھا۔ یہاں اُن کا بیان ختم ہوتا ہے۔
 درس شرف نبو دز الواح الجبیدی
 لوح جمالی و دست مرارا برابر است

تصوف و طریقت کے مسائل تو اوپر بیان ہو چکے اب ہم (الاف) اُن چار اخلاق پر بحث کریں گے جن کی تکمیل و اشاعت ہی انبیاء کی بعثت کا اصل مقصود تھا۔ اور اس کے بعد رب (نبی نوع انسان) کی فطری استعدادوں کا ذکر ہوگا۔ اور ہم بتائیں گے کہ کس مسئلہ کے لئے کون سا کام مناسب اور موزوں ہوتا ہے اور (ج) قدرت کی طرف سے انسان کے اندر جو لطائف و دلیات کئے گئے ہیں، اُن پر گفتگو ہوگی، نیز (د) اصحاب یسین کے مختلف طبقات کا ذکر ہوگا اور (ک) خوارقِ عادت امور اور کرامات کیسے ظہور پذیر ہوتی ہیں، اُن پر ہم بحث کریں گے۔

بات یہ ہے کہ یہ سب چیزیں تصوف و طریقت کے مسائل کو پوری طرح سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ اس لئے ہم یہاں ان کو مختصر طور پر بیان کر رہے ہیں۔ ادبیات کے احوال و کوائف میں عام طور پر جو اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض

ایسے ہوتے ہیں جو بہت زیادہ ریاضت کرتے ہیں اور بعض بہت کم۔ اور بعض سے کرامات ظاہر ہوتی ہیں۔ اور دوسروں سے سرے سے کوئی کرامت ظاہر نہیں ہوتی۔ یہ چیزیں جاننے کے بعد مالک کو ان میں اور نیز اس طرح کے جو اور مسائل میں ان میں تشویش لاحق نہیں ہوگی۔

انسانیت کے چار بنیادی اخلاق

اس فیقر کو بتایا گیا ہے کہ تہذیب نفس کے سلسلہ میں شریعت کا مقصد دراصل یہ ہے کہ انسانوں میں یہ چار خصلتیں پیدا ہوں، اور جو چیزیں ان چار خصلتوں کے خلاف اور ان کی ضد ہیں، ان کی نفی کی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو انہی چار خصلتوں کو بروئے کار لانے کے لئے مبعوث فرمایا۔ اور تمام شرائع الہی کا یہی مقصد ہے کہ وہ ان چار خصلتوں کی تلقین کریں۔ اور ان کو حاصل کرنے کی طرف لوگوں کو رغبت دلائیں۔ اور نیز جن رسوم اور اعمال سے یہ خصلتیں پا ہو سکتی ہیں، ان کی لوگوں میں ترویج کریں۔ اور جن شرائع الہی پر ترغیب و تحریص کا سارا زور انہی چار خصلتوں کے پیدا کرنے پر مرکوز ہے۔ اور جن چیزوں سے لوگوں کو ڈرایا گیا ہے، وہ حقیقت میں وہ چار خصلتوں ہی کی ضد ہیں۔

”تر“ یعنی نیکی عبارت ہے اُن اعمال اور ذرائع سے، جن سے یہ چار خصلتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور وہ اعمال اور وسائل جو ان خصلتوں کے خلاف اثر پیدا کرتے ہیں۔ ان میں پڑتا ”اثم“ یعنی بدی ہے۔ اور نیز وہ اخلاق جو اس زندگی کے بعد دوسری دنیا میں انسانوں کے کام آئیں گے، اور ان کے نہ ہونے سے ان کو دباؤ نقصان پہنچے گا یعنی اخلاق حسنہ وہ ہیں چار خصلتیں ہیں۔ جس شخص نے ان چار خصلتوں کی اصل حقیقت کو اپنے ذوق و وجدان سے جان لیا۔ اور نیز وہ اس راز کو بھی پا لیا کہ ہر زمانے میں اور ہر قوم میں جو بھی شریعت بنی، اس شریعت کے پیش کردہ احکام اور اعمال کس طرح ان چار خصلتوں تک پہنچے اور ان کی تکمیل کے ذرائع اور واسطے بنتے چلتے آ رہے ہیں انہیں جس شخص نے اس راز کو معلوم کر لیا، وہ صحیح معنوں میں ”نقیبہ فی الدین“ اور ”راہِ فی العلم“ ہے اور وہ شخص جس نے کہ شریعت کے ظاہری اعمال میں ان خصلتوں کا سراغ لگایا، اور وہ ان کے رنگ میں رنگا گیا اور اس نے اپنی ذات کے اصل جوہر میں ان خصلتوں کا اثر جذب کر لیا تو اس کا شمار ”مہنین“ میں سے ہو گا۔

قصہ مختصر، ان چار خصلتوں کی معرفت بہت بڑی بات ہے اور اس بندہ ضعیف پر خداوند کریم کا عظیم الشان جہان ہے کہ اُس نے مجھے ان کی معرفت عطا فرمائی۔ ”وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَىٰ آلِهَاتٍ وَلَكِنَّ الْكَافِرِينَ لَا يَشْكُرُونَ“۔

ان چار خصلتوں میں سے پہلی خصلت طہارت ہے۔ قدرت نے ہر سلیم نفس انسان میں یہ خصلت ودیعت کی ہے۔ اور اُس میں فطری طور پر طہارت کی طرف میلان رکھا ہے۔ چنانچہ اگر ایک شخص اپنی سلامتی فطرت پر رہے۔ اور باہر سے کوئی اور چیز اس کے نفس میں خلل انداز نہ ہو، تو لامحالہ وہ طہارت کی خصلت کا حامل ہوگا۔

لفظ طہارت سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس جگہ طہارت سے ہماری مراد وضو اور غسل سے ہے۔ طہارت سے دراصل یہاں مقصود وضو اور غسل کی روح۔ اور اُن سے انسان کو جو نور و انشراح حاصل ہوتا ہے، اُس سے ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آپ ایک پاکیزہ طبیعت والے ایسے آدمی کو دیکھئے کہ اُس کی حرکات و سکنات اور آثار و اقارین سے یہ قیاس لگایا جاسکے کہ اس کا مزاج صحیح اور اس کی فطرت سلیک ہے۔ اور نیز اس میں بحیثیت ایک انسان کے وہ اودہ استعداد موجود ہے، جو انسانیت کے فطری تقاضوں اور اس کے نوعی احکام کو قبول کر سکتا ہے۔ فرض کیا یہ شخص نفس کے ذیل رجحانات اور جھوک، غضب و خفہ اور جماع وغیرہ کی جہتی خواہشات سے جو انسان کو تشویش میں ڈال دیتی ہیں، فارغ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اگر یہ شخص نجاستوں میں لوٹ ہو جائے۔ اور اس کے بدن پر میل پیل بھی ہو اور جہاں بال نہیں ہونے چاہیے، وہاں بال بڑھ گئے ہوں۔ اور نیز اسے پشیاب اور پاخانہ لگ رہا ہو۔ اور اُس کے پیٹ میں

ریح کا زور ہو جس کی وجہ سے اُسے محسوس میں گرانی محسوس ہو رہی ہو یا اس نے ابھی ابھی جماع اور اُس کے خیالات و مہمات سے فراغت پائی ہو۔ ان حالات میں اگر یہ شخص اپنے صبح و بعدان کی طرف متوجہ ہوگا تو لامحالہ اُسے اپنی اس حالت سے کراہت ہوگی۔ اور وہ اپنے اندر جڑ چڑھن لگی اور رنج و غم محسوس کرے گا۔

اب یہی شخص بول و براز سے فراغت حاصل کر لیتا ہے۔ وہ غسل کرتا ہے، زانڈباؤں کو جسم سے دُور کرتا ہے۔ نئے کپڑے پہنتا ہے۔ اور خوشہ لگاتا ہے۔ اس حالت میں وہ اپنے صبح و بعدان کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اُسے بڑی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے اندر سرور و انشراح پاتا ہے۔ ان فرض اس کی پہلی حالت ناپاکی اور حدت کی تھی جس کی وجہ سے اس کی طبیعت پر تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور یہ دوسری حالت نورِ طہارت کی ہے جس سے اس کی طبیعت کو مسرت اور کشائش حاصل ہوئی۔

انسان کے فرض کو جب ناپاکی کی تاریکی گھیر لیتی ہے تو اُس کے اندر فیضانی دُور سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ خوفناک خواب دیکھتا ہے۔ اور اُس کے دل پر سیاہی بھرم کر آتی ہے۔ اور جب اس پر نورِ طہارت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے نئے فرشتوں کے الہامات ہوتے ہیں۔ اور وہ ابھی ابھی خوابیں دیکھتا ہے۔ اور نیند اور بیداری دونو حالتوں میں ایک نور اس کے دل کا احاطہ کئے رہتا ہے۔ نورِ طہارت

واہوں میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ آفتاب اُن کے دل میں یا اُن کے منہ میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کی اُن کو بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور اُن میں سے بعض خواب میں مانتاب اور ستاروں کو اپنے ماتھے اور جسم کے دوسرے اعضاء سے چٹا ہوا دیکھتے ہیں۔ اور بعض خواب میں نور کو بارش کی طرح برسا دیکھتے ہیں۔ الغرض یہ اور اس طرح کی اور چیزیں حقیقت میں آثار و مظاہر ہوتے ہیں ایک وجدانی کیفیت کے جس کو اُنس و نور سے بہتر کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس وجدانی کیفیت کو ہم تفصیل سے نسبتِ طہارت کے ضمن میں پہلے بیان کر آئے ہیں۔

نورِ طہارت کی یہ کیفیت انسان کی جملہ کیفیات میں سے سب سے زیادہ طاریات سے مشابہ ہوتی ہے۔ اور طاریات کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمہ جہت کی تمام آفاتوں سے پاک ہیں۔ اور انہیں بذاتِ خود اپنے آپ سے سرور و انبساط ملتا ہے۔ اور نیز ان کو اپنے اس مقام سے جو انہیں خدا کے قلم کے طرف سے تفویض کیا گیا ہے۔ بڑا افسوس ہوتا ہے انسانوں میں سے جب کوئی شخص طاریات سے اپنا رخ جوڑتا ہے تو اس کی وجہ سے اُسے یہ جدِ خوشی و مسرت محسوس ہوتی ہے۔ اور جب خوشی و مسرت کی یہ حالت اس کے نفس میں راسخ ہو جاتی ہے تو یہ ایک کلمہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ اس شخص کو طاریات سے منکاشت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس پر طہیت کی کیفیات کی روح اور اُن کی نعمتوں

کے ماحصل مقصود کا دروازہ کھل جاتا ہے ۔

مہارت کے بعد دوسری خصلت اللہ تعالیٰ کی جناب میں غر و خضوع اور اس کی طرف اپنی چشم دل کو کبسر متوجہ کرنے کی ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سکیم انفس آدمی کو جب کہ وہ اپنی طبیعت کی داخلی ضرورتوں اور گرد و پیش کی خارجی پریشانیوں سے فراغت حاصل کر چکا ہو، اگر اسے اس حالت میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور جلالت کائنات اور کبریائی کو یاد دلانیں، اور اس کو کسی نہ کسی طریق سے قوت باری کی طرف متوجہ کر دیں تو اس وقت اس شخص پر حیرت و دہشت کی سی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ اور ادبیات سے ماوراء جو مقدس اور مجرب و عالم ہے، اس عالم کے رنگوں میں سے ایک نہ ایک رنگ اس شخص کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے ۔ چنانچہ جب یہ شخص حیرت و دہشت سے گزر کر اس سے نیچے جو مقام ہے، اس میں آتا ہے، تو اس مقام میں اس شخص کی ہی حیرت و دہشت خشوع و خضوع اور عاجز و نیاز مندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ اس وقت اس شخص کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے کہ ایک غلام اپنے آقا کی حضوری میں ہوتا ہے یا ایک دہقان بادشاہ کے دربار و حاضر ہوتا ہے ۔ یا جس طرح ایک محتاج مائل ایک غیاض آدمی کے در پر کھڑا ہو ۔ انسان کی خشوع و خضوع اور دعاؤ مناجات کی یہ کیفیت اس کی باقی تمام کیفیات سے زیادہ ملار اٹنے کے دوزخ شوق کی کیفیت سے مشابہ ہے جو اُن میں اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان اور اس کی کبریائی

کے لئے ہے۔ چنانچہ جب انسان کا دل خشوع و خضوع کی کیفیت میں بالکل رنگا ہوتا ہے اور خشوع و خضوع کا لگا اس کی فطرت کے جوہر اصلی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ تو اس حالت میں اس شخص کے نفس اور ملا اسٹے کے درمیان ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ جس کے راستے سے اس شخص پر ملا اسٹے کی طرف سے علیل انقدر علوم و معارف نازل ہوتے ہیں اور ان علوم و معارف کے لئے تجلیات الہی غالب بنتی ہیں۔

(طہارت اور خشوع و خضوع کے بعد تیسری خصلت سلامت کی ہے اور سلامت کے معنی یہ ہیں کہ انسان لذتوں، انعام، بخل، حرص اور اس طرح کی اور بُری باتوں کے پیچھے اپنے نفس کی سخی خواہشات کا غلام نہ ہو۔ انسان میں جنسی خواہشات ہیں، انکی قدر سلامت کے بھی شعبے ہیں۔ چنانچہ ہر خواہش کے مقابلے میں سلامت کے اس شعبے کو ایک نام دیا گیا ہے۔ مثلاً

شہوانی اور کھانے پینے کی خواہشات کا اثر قبول نہ کرنا صفتِ ہر
 تن آسانی اور ترکِ عمل کی خواہش سے مطلوب نہ ہونا جہادِ ہر
 گھبراہٹ اور پریشانی کی خواہش کو روکنا صبرِ ہر
 انتقام کی خواہش سے مطلوب نہ ہونا عفوِ ہر
 حرص کی خواہش سے بچنا قنوتِ ہر
 شریعت نے جو حدود مقرر کی ہیں، اُن سے تجاوز کرنے کی خواہشات کو دانا تقویٰ ہے۔

الغرض یہ تمام کی تمام چیزیں سلامت میں داخل ہیں۔ لیکن ان سب کی اصل صرف ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ عقل کے عمومی احکام کو نفس کی کبھی و کبیس خواہشات پر پورا غلبہ حاصل ہو جائے۔ اس کے علاوہ سلامت کے ضمن میں جن اعمال اور افعال کا ایسی ذکر ہو چکا ہے انسان ان اعمال و افعال کو اسی طرح کرے اور اتنا عرصہ برابر کرتا رہے کہ نہایت کی اصل حقیقت بطور ایک کیفیت کے نفس انسانی میں جاگزیں ہو جائے اور نفس سلامت کی اس کیفیت کو ایک مستقل نگہ بنائے۔

جس شخص کے نفس میں سلامت کی یہ کیفیت راسخ ہو جاتی ہے، ایسی کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ مرتا ہے تو اس دُنیا کی زندگی میں اِدھر اُدھر کے جو بُرے اثرات اُس کے نفس پر هجوم کئے ہوئے ہوتے ہیں وہ موت کے وقت اس سے یکسر چھٹ جاتے ہیں۔ اور وہ اس دُنیا سے اس طرح گھر کر دوسری دُنیا میں پہنچتا ہے جیسے کہ سونا کھٹالی سے گزند ہن کر نکلتا ہے۔ انسان کا عذابِ قبر سے محفوظ رہنا غالباً اسی سلامت کی خصلت پر موقوف ہے۔ جو نیا نے اس خصلت کا نام زہد، حریت اور ترکِ دُنیا رکھا ہے۔

ان چار خصلتوں میں سے آخری خصلت عدالت کی ہے۔ اور عدالت ہی پر دُنیا میں عادلانہ نظام اور سیاسی اصول و کلیات کا دار و مدار ہے۔ عدالت کے بہت سے شعبے ہیں۔ ان میں سے ایک شعبہ ادب کا ہے۔ ایک آدمی اپنی حرکات و سکنات پر برابر نظر رکھتا

ہے اور اس شخص میں جو بہترین وضع ہوتی ہے، اُسے اختیار کرتا اور اس پر چلتا ہے۔ اور جو بھی معاملہ اُسے پیش آتا ہے، اُس میں وہ مناسب ترین پیراہ اختیار کرتا ہے۔ اور اُس کی طبیعت کا فطری طور پر اسی طرف میلان بھی ہوتا ہے۔ اس شخص میں جب یہ کیفیت بطور عادت کے پیدا ہو جاتی ہے، تو اُسے ادب کہتے ہیں۔ انسان کا اپنے کاموں کی یکجہاں، اور نیز جمع و خیر، خرید و فروخت اور اس طرح کے دوسرے معاملات میں عدالت کو ملحوظ رکھنا کفایت ہے۔ مگر کو ٹھیک طرح جہاں حریت ہے، شہروں اور لشکروں کا اچھی طرح سے انتظام کرنا سیاست مرنہ ہے۔ اور ساتھیوں میں اچھی طرح زندگی گزارنا، ہر شخص کا حق ادا کرنا، اور ہر ایک کے ساتھ حالات کے مطابق انصاف برتنا اور اُس کو خوش خوش بلحاظ معاشرت ہے۔ ان غرض یہ تمام خصلتیں عدالت کے شعبے میں۔ اور ان سب کی اصل ایک اور صفت ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کا نفس ناخلفہ خود اپنی فطرت کے تقاضے سے عادلانہ نظام اختیار کرے۔ اور نہ صرف اختیار کرے بلکہ وہ اس نظام کو برسر کار رکھنے میں کوشاں بھی ہو۔

جس شخص میں عدالت کی فصلت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، اُس شخص کو طارِ اعلیٰ کے ان افراد سے جو دنیا میں حق سبحانہ کی فیض رسانیوں کا واسطہ بنتے ہیں۔ اور جن کی اصل فطرت میں عادلانہ نظام کے قیام کی استعداد و دیعت ہوتی ہے۔ اور نیز ان میں عادلانہ نظام کو قبول

انہوں نے کیلئے بڑی بہت ہوئی ہے۔ انہیں اس شخص کو ملا راعے کے افراد کی بڑی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس شخص پر ملا راعے کے ان افراد کے دلوں پر سوچ کی شعاعوں کی طرح نور کی بارش ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے اس شخص کو دنیا میں بڑی آسودگی اور کشائش میسر آتی ہے۔

اس آسودگی اور کشائش کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اور ہر شخص کی جیسی استعداد ہوتی ہے، اُسی کے مطابق اس کو ان میں سے حصہ ملتا ہے۔ اور اپنی طبیعت کے اعتبار سے ہی وہ ان سے محفوظ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کو اپنے ساتھیوں کی صحبت بہت مرغوب ہے۔ اور دوسرا خوشگوار گانا، عمدہ لباس، پاکیزہ گھر اور چاشنی جیوی کو پسند کرتا ہے۔ اور اسی پر دوسروں کے رجحانات کو بھی تیس کیا جاسکتا ہے۔ ایک شخص ہے جو عادلانہ نظام کی مخالفت کرتا ہے۔ اور شریعت کے احکام کو بجا نہیں لانا۔ اور ایسے کام کرتا ہے۔ جن سے کو عام لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ اس شخص کے اور ملا راعے کے ان افراد کے درمیان جو کو دنیا میں فیوض الہی اور نعمت ہائے خداوندی کو پہنچانے کا ذریعہ ہیں، نفرت اور وحشت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ملا راعے کی طرف سے اس شخص پر خلعت و تاریکی کی بارش ہوتی ہے۔ اور وہ محسوس کرتا ہے کہ ہر جانب سے اس پر تلکی پورش کر رہی ہے۔ اور بعینہ یہی حال اُس شخص کا بھی ہوتا ہے، جو اس دنیا میں خشوع و خضوع کی فصلت سے آشنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ایسا ہوا کہ اس نے اپنے اندر

موضوع و خضوع کے خلاف جو بڑی عادتیں تھیں، وہ بیدار کر لیں۔
 یہ شخص جب اس دُنیا سے انتقال کرتا ہے تو اس کو تاریکیوں کی تہ پہنچ
 گشتائیں گھیر رہتی ہیں۔

لیکن آخر یہ راز کیا ہے۔ اور یہ کیسے ہوتا ہے؟ بات دراصل یہ
 ہے کہ اس زندگی کے بعد جو دوسرا عالم ہے، اُس کا تقاضا یہ ہے کہ
 وہاں عالم جبروت کے حقائق کا انکشاف ہو۔ اب جو شخص اس عالم
 میں مشغول و خضوع سے متصف نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس وہ مشغول
 و خضوع کے خلاف عادتیں لے کر دوسرے عالم میں پہنچتا ہے، تو اُس
 پر وہاں عالم جبروت کے حقائق خلکشف نہیں ہو پاتے، جس کی وجہ
 سے اُسے اُس عالم میں بڑی اذیت اور کوفت ہوتی ہے۔ اور جو شخص
 اس زندگی میں سادہ کے خلاف جو بُرے اخلاق ہیں، ان میں مبتلا
 ہوتا ہے، اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ دُنیا کے علائق مثلاً جاہ و مال
 اور ادا و کی محبت اور اسی قبیل کی اور خواہشات بھوک اور پیاس
 کی طرح اُس کے دل پر چڑھ کر رہتی ہیں۔ چنانچہ یہ چیزیں اس شخص
 کے دل پر اس طرح کے اثرات چھوڑتی ہیں، جیسے کہ ہم ضرر کو زور سے
 موم پر لٹکائیں۔ اور مہر کے فتوش موم پر چسپ جائیں۔ اور اس کے
 خلاف جو شخص سادہ کے اوصاف کا حامل ہوتا ہے، اُس کے
 نفس کی مثال پانی کی سی ہوتی ہے کہ جس طرح پانی پر کوئی نقش نہیں
 ٹھیرتا۔ اسی طرح اس کا نفس بھی دُنیا کے تعلقات کا اثر قبول نہیں کرتا

اسی مضمون کا مولف کا ایک شعر ہے
 بوسعت مشرباں رنگ تعلق درنی گیرد
 اگر تفتے زنی بروئے دریا بے اثر باشد

شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صفتِ طہارت کے اکتساب کے لئے وضو، غسل اور اس طرح کی اور چیزیں جن کو ہم نسبتِ طہارت کے ضمن میں بیان کرتے ہیں، ضروری قرار دی ہیں۔ اور شروع و ختم کی خصلت کے حصول کے لئے نمازیں، دعاؤں، مناجات، تلاوتِ قرآن، ذکر و اذکار اور توبہ و استغفار وغیرہ اعمال مشروع فرمائے ہیں اور اسی طرح سماعت کے حصول کے لئے غلو، حسنِ خلق اور اس طرح کے اور اخلاق حسنہ تعلیم کئے ہیں۔ اور عبادت کی خصلت پیدا کرنے کے لئے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جباروں کی عبادت کا حکم دیا ہے ہر ایک کو سلام علیکم کہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اور اس کے علاوہ اور حدود و آداب بھی تعلیم کئے ہیں۔

الغرض ان امور کا مفصل بیان بڑی طوالت پاتا ہے جس شخص کو تفصیلات کا شوق ہو، وہ ہماری کتابِ حمد و ثناءِ باری کی طرف رجوع کرے۔ یہاں تو ہمارا مقصد صرف ان عبادتوں کا تعارف کرنا ہے تاکہ وہ طریقیت کے ساتھ ان سے اچھی طرح سے واقف ہو جائیں۔ اور خوب سوچ سمجھ کر، اور پوری تحقیق کے بعد وہ ان خصلتوں کے حصول کو اپنا نصب العین بنائیں، اور نیز اپنے اعمال و معمولات میں

وہ ان نصلتوں سے بے تعلق نہ ہونے پائیں، اور اپنی طبیعت کو ان
 بُری عادتوں کی طرف جو ان فضائل کے خلاف ہیں، متوجہ نہ ہونے دیا۔
 اب ایک شخص ہے جس نے کہ حضرت احسانؑ کو جو کہ عبارت ہے
 نورِ چلارت اور غلامِ مناجات سے، جان لیا۔ اور پھر اس نے احسان
 کی اس صفت کو عامل بھی کر لیا۔ لیکن اس کے بعد ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ
 وہ اسی وجہ سے احسان کی کیفیت کو اپنے اندر نہیں پاتا، یا اگر پاتا
 بھی ہے تو بہت کم درجہ میں اس شخص کو چاہیے کہ وہ اس امر کی تحقیق کرے
 کہ ایسا کیوں ہوا؟ اگر اس کا سبب اس شخص کی طبیعت کی سرکشی ہے، تو وہ
 اس کا تذکرہ روزوں کے ذریعہ کرے، اور اگر شہوانیت کا غلبہ ہے تو
 وہ اس کا عداوانہ علاج یا کینزک سے کرے، اور اگر صفت احسان کی یہ حالت
 لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ کٹھنے بیٹھنے سے ہوئی ہے تو وہ اعتکاف میں
 بیٹھے، اور لوگوں سے ٹانگنا بھی کم کر دے، اور اگر اس کے داغ میں لہر
 اُٹھ کر کے پریشان کن خیالات جمع ہو گئے ہیں اور انھیں کا اس کی صفت
 احسان پر یہ بُرا اثر پڑا ہے تو وہ کافی عرصہ تک ذکر و اذکار کرے اور
 اگر اہل وطن کے رسوم و رواج نے طبیعت پر غلبہ پایا ہے، اور یہی چیز
 کیفیت احسان میں خلل ہو رہی ہے تو اسے چاہیے کہ وطن سے ہجرت
 کر جائے۔

بنی نوع انسان کی اصناف و انکی استعدادیں

اس فقیر کو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف استعدادوں پر پیدا کیا ہے۔ اور ہر انسان اپنی فطری استعداد کے مطابق ہی کمال حاصل کرتا ہے۔ اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس میں عین استعداد ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ حاصل کرے۔ یہ خدائے عز و عظیم کا اعزاز ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم سٹوک پہاڑ اپنی جگہ سے مل گیا تو اس کو مان لو لیکن اگر کسی شخص کے متعلق سٹوک اس نے اپنی خصلت چھوڑ دی تو کبھی یقین نہ کرو کیونکہ ہر انسان اپنی فطرت اور جبلت ہی کی طرف ہمیشہ لوٹتا ہے۔ اس حدیث میں مجتہد صادق صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ دراصل انسانوں کی اپنی استعدادوں کی طرف ہے۔

اب ایک شخص ہے جس کو ایک خاص روش پر چلنے اور ایک مخصوص طریقے کو اخذ کرنے کی قدرت سے استعداد ملی ہے۔ اگر وہ اس

کو چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنی چاہئے تو خواہ وہ کتنی ہی محنت کرے اور اس میں کس قدر بھی مشقت اٹھائے۔ وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا۔

ترجمہ نہ دینی بہ کعبہ ہے اعرابی ہیں راہ کو قوی دروہی ترکستان است
 اسی طرح ایک اور شخص ہے، جو ایک چیز میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اُس کی فطرت اور جبلت دوسری قسم کے کمال کا تقاضا کرتی ہے۔ اب وہ اس کے لئے خواہ وہ کتنی بھی کوشش کرے اُس کی کوشش ہر حال میں رائیگاں جاے گی۔

کسے در ضمن کا مبی قلیہ جوید اصاح العرفی طلب الحمال
 اُن عالی مرتبہ علوم و معارف میں سے جو اس بندۂ ضعیف کو ملے، کئے گئے ہیں، ایک علم نئی آدم کی استعدادوں کی معرفت اور اُن کی تعداد اور میزان میں سے ہر ایک کی علامت اور اُن کے ساتھ کمال کے جاننے کا ہے۔ اس علم کا فائدہ یہ ہے کہ ایک شخص داریا تک اپنی ذاتی استعداد کی حدود کو سمجھ کر کے انہی کے مطابق اپنی راہ بخویر کر سکتا ہے۔ اور پھر وہ اس راہ کو برابر اپنی فکر کے سامنے رکھ سکتا ہے یا اگر ساک خود یہ کام ذکر سکتا ہو تو اُس کے مرشد مشفق کو چاہیے کہ وہ اس علم کی مدد سے ساک کی جبلت استعداد کو دیکھے۔ اور پھر اُس کے مطابق اس کو مناسب راہ پر لگائے۔ الغرض یہ ہم پر اور نیز دوسرے لوگوں پر اللہ کا احسان ہے۔ لیکن اکثر لوگ ہیں کہ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔

نہی آدم کی ان جلی استعدادوں کے بیان سے پہلے اس ضمن میں چند
 قہدی امور کا جاننا بہت ضروری ہے، کیونکہ ان استعدادوں کی معرفت
 کا انحصار ان قہدی امور پر ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے
 انسان میں دو قوتیں ودیعت کی ہیں۔ ایک قوت فکریہ اور دوسری قوت
 یہیمیہ۔ ان کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں ایک قوت نسمہ ہے، اور یہ نسمہ
 عبارت ہے روح ہوائی سے، اور روح ہوائی کا مطلب یہ ہے کہ یہ
 روح جسم میں طبعی عناصر کے عمل اور رد و عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ اس
 نسمہ یا روح ہوائی سے اوپر انسان میں ایک اور چیز بھی ہے جسے نفس
 نامہ کہتے ہیں۔ اور جو نسمہ پر تصرف کرتا ہے۔ نفس نامہ اس حالت
 میں جب کہ وہ نسمہ پر تصرف کر رہا ہوتا ہے، دورِ حجاب رکھتا ہے اور ایک
 رحمان انسان کو بھوک، پیاس، غم، غصہ، حسد، غشہ اور غشی
 کے جلی تقاضوں کی طرف اس طرح مائل کر دیتا ہے کہ انسان انسان
 نہیں بلکہ حیوان ہو جاتا ہے۔ اور نفس نامہ کا دوسرا رحمان انسان
 کو فرشتوں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس حالت میں وہ
 حیوانی تقاضوں سے رہائی حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا
 ہے کہ اس مادی عالم سے اوپر جو عالم بخرو ہے وہاں انسان پر انسانی
 سرور کا نزول ہوتا ہے۔ اور اس واسطے کہ وہ افراد جو اہل دنیا کو
 فیض و برکات پہنچانے کا ذریعہ ہیں، یہ شخص ان کی طرف گوش
 بردار ہو جاتا ہے۔ اور اس مقام سے اس پر الہامات کا فیض ہوتا

ہے۔ اب اگر الہامات معائنہ قدرت کے امکانات کے متعلق ہوں تو ان سے دنیا میں علوم طبعیہ کی بنا پڑتی ہے۔ اور اگر الہام کسی نئے نظام کو شروع کرنے اور اس کو رواج دینے کے متعلق ہوں تو وہ شخص جس کو یہ الہامات ہوتے ہیں، وہ ان کاموں کو اس طرح کرتا ہے گویا کہ وہ ان کے لئے اوپر سے نامور ہے۔ اور خود اس کو ان کاموں کی کوئی ذاتی خواہش نہیں

انفرنس انسان کا نفس مطلقہ حب اس کے ضمیر پر تصرف کرتا ہے تو اس سے انسان کے اندر صبا کہ ہم نے ابھی بیان کیا دو رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک رحمان کا رخ نیچے کو ہوتا ہے جسے سفلی رحمان کہنا چاہیے اور دوسرے کا رخ اوپر کو ہوتا ہے، جو علوی رحمان کہنا ہے۔ جب انسان پر سفلی رحمانات کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ سرتاپا حیوانیت

کے بیٹے بنی تقسیم ڈاکٹر یونگ نے جو علم تجزیہ نفس کے موجد ڈاکٹر فریڈ کا مشہور شاگرد ہے کہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ جب تک مرد میں ایک انسانی خواہشات جیسا کہ غلبہ ہے یعنی ان کو بارگھنے میں یا بھگدھنے میں انسان کے کردار تک رہتے ہیں اور جب کہیں خواہشات حیوانی کا غلبہ انسان پر غالب آجاتے ہیں تو وہ بال بد اور بدیہیچہ بال بھی بد ہو جاتی ہے اس معنیوں کو ایک نئی شاعر نے اس طرح لکھا ہے

| | |
|------------------------------|---------------------------|
| آدمی زادہ طرذ محبوب است | از فرشتہ سرشت و از حیواں |
| گر کند میل این شود کم ازین | ور کثیر قصدان شود بی ازاں |
| افوز از غلط فقراد مصطفیٰ جنگ | دختریم |

اور بہیمیت کا پیکر بن جاتا ہے۔ اور اُس میں علویت اور ملکیت کا اثر تک
 باقی نہیں رہتا۔ اور جب علوی رجحان اس پر غلبہ پالے تو وہ بالکل فرشتہ
 بن جاتا ہے۔ اور اس میں بہیمیت سرے سے غائب ہو جاتی ہے۔
 انسان کی یہی وہ طبعی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اُسے چند باتوں
 کے کرنے اور چند باتوں کے نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اُسے اس
 معاملہ میں چار پایوں اور فرشتوں کی طرح آزاد نہیں جوڑا گیا بات
 یہ ہے کہ چار پایوں میں اگر بہیمیت ہے تو سرتاپا بہیمیت ہی بہیمیت ہو
 اور وہ طبعی طور پر اسی مائع بہیمیت کے تقاضے پورا کرنے پر مجبور ہیں
 اسی طرح فرشتے ملکیت ہی ملکیت ہیں۔ اور اُن میں بہیمیت کا شائبہ
 کب نہیں۔ لیکن ان دونوں کے برعکس انسان کا معاملہ ہے وہ وہ یک
 وقت فرشتہ بھی ہے اور حیوان بھی۔ اُس میں ملکیت کے رجحانات
 بھی ہیں۔ اور جو انیت کے تقاضے بھی۔ چنانچہ اسی نے ملکیت کو
 اُبھارنے کے لئے اُسے یک کاموں کا حکم دیا گیا۔ اور اس کے حیوانی
 تقاضوں کو دبانے کی خاطر بُرے کاموں کے پھینے کی فہمائش کی گئی۔
 اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں ”تعلما الانسان انہ کان
 ظلوماً جوہراً فطرت انسانی کے اسی راز کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ
 ”ظلوم“ کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں عدل کی صلاحیت تو
 موجود ہے مگر وہ عدل نہیں کرتا اور جہول سے مراد یہ ہے کہ وہ علم
 تو حاصل کر سکتا ہے، لیکن بالفعل علم سے عاری ہے۔

غلامی طلب یہ ہے کہ ملکیت اور بھیمیت، یہ دونوں کی دونوں قوتیں تمام نبی نوع انسان میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن کسی انسان میں بھیمیت کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ اور ملکیت نسبتاً کم۔ اور کسی میں بھیمیت کم پائی جاتی ہے۔ اور ملکیت نسبتاً زیادہ۔ اور پھر قوت ملکیت کے بے شمار درجے ہیں۔ اور اسی طرح بھیمیت کے بھی لاتعداد درجات ہیں۔ اب بھیمیت اور ملکیت کا کہیں زیادہ اور کہیں کم پایا جاتا اور پھر کسی میں ان کا ایک درجے میں، اور کسی میں دوسرے درجے میں موجود ہونا۔ یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے ایک انسان میں ایک، استعداد ہوتی ہے۔ اور دوسرے میں بالکل دوسری بنا جب اس طرح نبی نوع انسان میں الگ الگ استعدادیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تو استعدادوں کا ایک اجمالی بیان ہوا۔ اب ان کی تفصیل سنئے۔

مانکہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نا۔ اسٹلے کے مانکے اور دوسرے ملا۔ اسٹلے کے مانکے۔ یہ ملا۔ اسٹلے کے مانکے اسٹلے کے علم میں رنگے ہوتے ہیں۔ اور وہ جو مہاشن سے یہ کائنات میں طبع ظہور پذیر ہوئی یہ ملا۔ اسٹلے کے مانکے کے اصول و مبادی سے واقف ہوتے ہیں۔ اور خدا قاسنے کی قدرت، خلق، تدبیر اور تبدیلی کے ذریعہ اس کائنات میں جس طرح برسرِ کار ہے، ملا۔ اسٹلے کے یہ مانکے اس نظام الہی کے اصول و کلیات اور اس کی حکمت کا علم رکھتے ہیں۔ اور اس سے انھیں بڑی

وانبلی اور ربیت جی ہوتی ہے۔ باقی رہا ملاو ساغل کے ٹانگہ ان کا کام یہ ہے کہ جو کچھ اوپر سے ان پر احکام وارد ہوں، وہ انہیں بجا لائیں اور الہام اور احکام کے ذریعہ دنیا کے مسائل میں تصرف کریں ملاو ساغل کے فرشتوں کو ان احکام کی جو اصل مصلحت ہوتی ہے اس کا علم نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ فرشتے ہر اس خاصے کی صورت کو جو دنیا میں ہونے والا ہوتا ہے، اور جس کے متعلق حظیرۃ القدس میں فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے، اخذ کر لیتے ہیں۔ ملاو ساغل کا حظیرۃ القدس کو ہونے والے واقعات کی صورت کا اخذ کرنا اس طور پر ہے جیسے کہ آئینہ میں ایک چیز کا عکس پڑ رہا ہے۔ اور وہاں سے یہ عکس دوسرے آئینے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اس ضمن میں وہ بات جی ملحوظ رہے کہ ان میں سے ہر فرشتہ صرف اسی دائرہ کا اوراق کر سکتا ہے، جس کی اس کی فطرت میں مناسبت ہوتی ہے۔

جس طرح ٹانگہ کی دو قسمیں ہیں۔ اسی طرح بہائم کی جی دو قسمیں ہیں۔ ایک، وہ جن کی قوت بحیثیت ذرہ درست ہوتی ہے۔ اور دوسرے وہ جن کی بحیثیت ضعیف ہے۔ مثال کے طور پر، ایک زکو یختے وہ صحیح مزاج نے کر پیدا ہوا۔ پھر مناسب غذا اسے ملتی رہی۔ چنانچہ اس کو بچنے کو خوب دودھ ملا اور کھانے کو باغراطہ چارا۔ اور بعد میں اسے کوئی ایسا عارضہ بھی لاحق نہ ہوا جس سے اس کے قوائے میں خلل آتا۔ یہ فریب اپنی جوانی کو پہنچے گا تو ظاہر ہے وہ عظیم آبشار

بلند، واژ اور زوردار ہوگا۔ اور اپنے عزم و ارادہ میں بڑا یقین اور
 غصے اور ارادہ میں بڑا سخت ہوگا۔ اور اسے کبھی یہ گوارا نہ ہوگا کہ کوئی دوسرا
 نرمی سے بہتر اس سے زیادہ بہادر، اس سے بڑھ کر دل والا اور اس
 پر غالب و طاہر ہو۔ چنانچہ اس کی نظروں میں اپنے سوا اور کوئی دوسرا
 نہیں چلے گا۔ اور نیز اس میں یہ ہمت بھی ہوگی کہ وہ سخت سے سخت
 محنت کر سکے۔ لیکن اگر ہم اس ترکِ نفسی کر دیں یا یہ زہد پاداشی طور پر بکڑا
 اور ناقص ہو۔ اور اسے بعد میں مناسب تربیت بھی نہ ملے اور وہ انہی
 حالات میں جو ان ہو تو لامحالہ یہ نرا اپنی شکل و ثباہت میں، جسمانی بناوٹ
 میں اور نیز اپنی عادات اور اپنے اخلاق میں پہلے نرم سے بالکل مختلف ہوگا۔
 ان دونوں کی مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ قوتِ ہیبت جب
 اپنے عروج کو پہنچتی ہے، تو اس کے دو مظہر ہوتے ہیں۔ اس کا ایک مظہر
 تو خدشہ عزم اور ہمت کی تندی ہے اور دوسرا مظہر خلقِ یعنی شکل و
 بناوٹ اور خلقِ یعنی عادات و اخلاق میں اس کا کمال اور مکمل ہونا ہے۔
 ہیبت کے پہلے مظہر کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہیبت روح کے چہرے کے
 لئے اس طرح کا حجاب بن جاتی ہے کہ روح اس کے اندر چھپ جاتی ہے
 گو وہ ہیبت میں کیسے رخصتا نہیں ہوتی۔ لیکن جب ہیبت کا غلبہ کم ہوتا
 ہے اور اس کی وجہ سے خدشہ عزم اور ہمت کی تندی میں قبضہ جاتی
 ہے تو پھر روح کو بھی بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اور ہیبت کے دوسرے
 مظہر کا اثر یہ ہے کہ اس میں ہیبت اخلاق و عادات کی شکل میں صرف

ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے نفس مغیر کسی شدت اور زندگی کے مبلغ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

الفرض بہیمیت کی پہلے تو دو قسمیں ہوں گی۔ ایک بہیمیت شدیدہ اور دوسری بہیمیت ضعیفہ، اور پھر بہیمیت جب کمال پر ہوتی ہے، تو اس سے دو اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ایک عزم و ارادہ میں خشکی اور سختی میں زندگی۔ اور دوسرے جسمانی بناوٹ اور اخلاق و عادات کی تکمیل و تکلیف اور بہیمیت کی ان تفصیلات کے بعد اب ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم بیان کر آئے ہیں کہ ہر انسان میں فلیکٹ اور بہیمیت کی دو قوتیں رکھی گئی ہیں۔ دو قوتیں جب ایک شخص میں جمع ہوتی ہیں تو کمال حال اس سے دو صورتیں پیدا ہوں گی۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ فلیکٹ اور بہیمیت میں آپس میں ٹکرائیں رہے۔ اور دونوں میں برابر رسوا کشتی ہوتی رہے اس کو تجاذب کہتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ فلیکٹ اور بہیمیت میں آپس میں ہم آہنگی ہو۔ اور ایک کا دوسری قوت سے کوئی نزاع نہ ہو، اس حالت کو اصطلاح کا نام دیا گیا ہے۔ تجاذب کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں قوت اپنے مخصوص مطالبوں کا تقاضا کرے۔ اور فلیکٹ اپنے فطری رجحانات کی طرف مائل ہو، اور ایک کا دوسرے سے بائیل کوئی امتزاج نہ ہو۔ اور ان میں سے ہر قوت اپنی اپنی اور پر پلنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ تجاذب کی حالت میں اگر قوت پریر کا غلبہ ہو آہے تو انسان دنیاوی لذات میں منہمک ہونا چاہتا ہے اور

اس صورت میں وہ ملکیت کی طرف مطلق کوئی انتہا نہیں کرتا۔ اور اس کے برعکس اگر تجاذب کی حالت میں ملکیت غالب ہو تو انسان بھیبت کے تمام اعمال و رجحانات سے یکسر کنارہ کش ہو کر مادیات کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے اور عالم جبروت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ ان احکام کی طرف جو بھیبت اور ملکیت کے درمیان برزخ کا حکم رکھتے ہیں، بالکل توجہ نہیں کرتا۔

اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ قوتِ ملکیت اپنے طبعی تقاضوں اور جو اس کا کمال کا درجہ ہے، اُس سے قدرے نیچے اترے۔ اور قوتِ بھیبت اپنی سطحی اور نامناسب خواہشات کو دبا کر ملکیت کی طرف قریب کرے اور یہ دونوں ایک ایسے مقام پر باہم ملیں کہ اس مقام سے بھیبت کو بھی مناسب ہو اور اس کا ملکیت سے بھی لگاؤ۔ اس ضمن میں بدنی عبادتیں و عمار و مناجات، سہاوت، عجزِ نفس، نفعِ عام کے کام کرنا، ماضیوں سے اچھی طرح انابت۔ ہر ایک کا حق ادا کرنا، نگر کی موت و سلامتی، اچھے خواب دیکھنا، فراست سے ٹھیک ٹھیک بات معلوم کرنا، بافت سے بھی باتیں سُنا اور اس طرح کے دوسرے اعلیٰ و احوالِ نسید ہوتے ہیں۔ انفرن میں ہر فرد میں ملکیت اور بھیبت کی اس طرح کی الگ الگ نوعیت کا خیال کرتے ہوئے انسانوں کو بے شمار اصناف و اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم انسانوں کی ان تمام اصناف و اقسام کو آٹھ بنیادی صنفوں کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔ ان میں سے سب انصاف

اہل اصطلاح کی ہونگی۔ اور چار اہل تہاذیب کی۔

اہل اصطلاح کی چار صنفیں حسب ذیل ہونگی

- (۱) مکی قوت شدید اور بڑھتی قوت شدید اور دونوں ہم آہنگی اور توازن
 - (۲) مکی قوت شدید اور بڑھتی قوت ضعیف اور دونوں ہم آہنگی اور توازن
 - (۳) مکی قوت ضعیف اور بڑھتی قوت شدید اور دونوں ہم آہنگی اور توازن
 - (۴) مکی قوت ضعیف اور بڑھتی قوت ضعیف اور دونوں ہم آہنگی اور توازن
- اسی طرح اہل تہاذیب کی بھی حسب ذیل چار صنفیں ہوں گی

- (۱) مکی قوت شدید اور بڑھتی قوت شدید اور دونوں خلع اور تضاد
- (۲) مکی قوت شدید اور بڑھتی قوت ضعیف اور دونوں نزاع اور تضاد
- (۳) مکی قوت ضعیف اور بڑھتی قوت شدید اور دونوں نزاع اور تضاد
- (۴) مکی قوت ضعیف اور بڑھتی قوت ضعیف اور دونوں نزاع اور تضاد

ان تہیدی امور کو جان لینے کے بعد اب انسانوں کی ان آٹھ صنفوں

پر غور کرو۔ تم دیکھو گے کہ ان میں سے ہر صنف کے اپنے اپنے احکام کیا۔

جس شخص میں قوت بڑھتی بہت شدید ہے۔ اسے سخت ریاضتوں کی

ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس کے لئے کمال حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے

کہ وہ غائب کرے۔ راقوں کو جاگے اور عاجزی و سکت اختیار کرے

شدید بے ہمتی و اسے سے جو بھی آثار و اعمال ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اندر

بڑی قوت اور شوکت رکھتے ہیں۔ اور اس شخص کی قوت میں بھی بڑی تاثیر

ہوتی ہے۔ اور نیز اس پر اس زور کا وجد طاری ہوتا ہے کہ سرسختی و غیورگی

ہیں اس کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کئی کئی دن تک اُسے اس دُنیا کی کوئی خبر نہیں رہتی۔

جس شخص کی قوتِ سیرِ ضعیف ہو، اُسے سخت ریاضتوں کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے سخت ریاضتیں اور تشویشِ خاطر کا باعث بنتی ہیں۔ اس شخص کو کثرت سے اور بہت عرصہ تک ذکر کرنا چاہیے۔ اور اس پر کمال کا دردِ اندہ کی طرح ہی مکمل سکنا ہے ضعیف ہیئت والے سے جو کرات ظاہر ہوتی ہیں وہ اتنی کم اہمیت رکھتی ہیں کہ ان کا ہونگاؤ نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔ نیز اس شخص کو وجد بھی آتا ہے تو بہت معمولی اور اس میں اگر کوئی معمولی سی چیز بھی غل ہو جائے تو وجد کا اثر زایل ہو جاتا ہے۔ گویا کہ وجد ایک درد کی طرح تھا کہ اٹھا اور فوراً غائب ہو گیا۔ یا وہ جیاب کے رنج کی طرح تھا کہ آیا اور پھر ختم ہو گیا۔

جس شخص کی ملکی قوت شدید ہو، وہ بڑے بڑے کمالاتِ خُلا نبوت، فردیت، خادِ جہا اور اس طرح کے دوسرے ہند مرتبہ احوال و مقامات کا اہل ہوتا ہے۔ اور اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ "سانِ قدیم" یعنی زبانِ الہی کا ترجمان بنتا ہے۔ اور وہ مادی عالم سے مادی راجہ عالمِ تجربہ ہے۔ اُس کے حالات کی خبر دیتا ہے۔ اور جس شخص میں ملکی قوتِ ضعیف ہو، اس کی تمام فکر و کشش کا قرعہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے دوس کی باتیں معلوم کر سکتا ہے۔ اور وہ اپنے سامنے ملکی افکار کو درخشاں دیکھتا ہے۔ الغرض یہ آثار و علامات میں (۱) شدید قوتِ سیر بھی کے۔

۲۰ ضیعت قوت بھیجی کے (۳) شدید قوت کلیہ کے (۴) ضیعت قوت کلیہ کے۔ ہم نے ان میں سے ہر ایک قوت کی الگ الگ تاثر بیان کر دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اہل اصطلاح اور اہل تجاذب کے مفہوم میں یہ قوتیں کس طرح افراتاذ ہوتی ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم اس پر گفتگو کریں گے۔

جو شخص کہ اہل اصطلاح میں سے ہو گا۔ اس کی طبیعت کا عام انداز یہ ہے کہ وہ اعضا و جوارح کے اعمال اور دل و دماغ کے احوال میں بحد مؤذوب ہوتا ہے اور وہ اپنے اندر حق شناسی کا جو ہر رکھتا ہے۔ خیر وہ مرین اور دنیا و دلو کے مصائب کو چہرہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور عام طور پر ایسے لوگوں میں قلع و اضطراب کی کیفیت نہیں ہوتی۔

جو شخص کہ اہل تجاذب میں سے ہو۔ اسے دنیا کے کاموں سے باطل کنہہ کش ہونے کا شق ہوتا ہے۔ اور اس کی بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ مادی دنیا سے بھر و اختیار کرے۔ اس شخص کی طبیعت کا قدرتی میلان اس عالم چار سو سے الگ ہونے اور اس سے نجات پانے کی طرف ہوتا ہے۔ چنانچہ اس شخص کی مثال اس پرندے کی سی سمجھے جیسے شخص میں بند کر دیا ہو۔ اہل تجاذب میں جس کی قوت شدید بھیجی ہوتی ہے۔ اس کی طبیعت میں بے حسنی اور اضطراب زیادہ ہوتا ہے۔ اور جس کی قوت بھیجی ضیعت ہو۔ وہ اگر کسی چیز کی طرف میلان رکھتا ہے، تو اس کے میلان میں بھی بقیہ اور زور نہیں ہوتا۔

اہل تجاذب میں سے کسی شخص میں اثر بھیجی قوت بہت زیادہ شدید ہو

نورہ جیسے بڑے کاموں پر نظر رکھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اگر اُس میں ملکی قوت بھی شدید ہو، نورہ انبیاء کرام کی طرح، ان جلیل القدر مقامات اور مناصب کو حاصل کرتا ہے، جو عمومی اصولی و کلیات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اس شخص میں صرف قوت بھی ہی بہت زیادہ شدید صورت میں موجود ہوگی۔ اور اس کے ساتھ شدید قوت ملکی نہ ہوگی تو یہ شخص میدان جنگ میں، غیرت و حمیت کے معاملات میں، اور اسی طرح کے دوسرے کاموں میں غیر معمولی جرأت و بہادری دکھائے گا۔

اپنی تجاذب میں سے جس شخص میں قوت بھی ضعیف ہو، اُس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں سب لوگوں سے زیادہ بڑے کاموں سے بے رغبتی کرتا ہے۔ لیکن اگر ضدیت بھییت کے ساتھ ساتھ اس میں قوت ملکی شدید ہے، تو اس طبیعت کا شخص خدا تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے دنیا کو ترک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن اگر بھییت کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت بھی ضعیف ہو اور یہ شخص اپنی استعداد کے مطابق کمال حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو یہ اتنا کر سکتا ہے کہ دنیا کو آخرت کے لئے ترک کر دے۔ لیکن اگر حالات سازگار نہ ہوتے اور وہ اپنی استعداد کو حصول کمال میں نہ لگاسکا تو اس کا انتخاب یہ ہوتا ہے کہ وہ سستی، عجز اور ناتوانی کی وجہ سے سب چیزوں سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ دنیا میں احکام شرع کے سب سے زیادہ فرمانبردار اہل اہلطار ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے جن لوگوں میں ملکی قوت شدید ہوتی ہے، وہ

اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود و اور اس کے دستوروں کے تحقق، اور ان کی حکمتوں کو جاننے والے ہوتے ہیں۔ لیکن اہل اصطلاح میں سے جن میں ملکی قوت ضعیف ہو، وہ محض ان حدود کے مقلد ہوتے ہیں، اور ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ظاہری اعمال کو بجا لائیں اور اس ضمن میں بالواسطہ وہ شرعی احکام کی روح سے بھی لذت یا نفع جانتے ہیں۔ اہل تجاذب اگر ہمیشہ کے بندھنوں کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں اور اس کے ساتھ ان کی ملکی قوت بھی شدید ہو تو ان کی بہت اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات اور فائدہ و بقا کے مقامات کی معرفت کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ان میں ملکی قوت ضعیف ہو، تو وہ شریعت میں سے سوائے ریاضتوں اور اوراد و وظائف کے جن سے کہ مفصود محض طبیعت کے بھی زور کو توڑنا ہوتا ہے، اور کچھ نہیں جانتے۔ اس قسم کی طبیعت والوں کے لئے انتہا درجے کی مسرت یہ ہوتی ہے کہ وہ ملکی انوار کو اپنے سامنے درخشاں دیکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ دوسروں کے دلوں کی باتوں کو معلوم کر لیتے ہیں۔ اور وقائع الہی کا بھی اُن کو علم ہو جاتا ہے۔ نیز اجابت دعا، تاثیر توبہ اور اس طرح کے دوسرے کمالات بھی اُن کو حاصل ہوتے ہیں۔

مجددیت، ظاہری پیر کی تربیت کے بغیر معرفت کا حصول، اور اگر پیر موجود بھی ہو تو اس کا زیادہ مسنون احسان نہ ہوتا۔ یہ سب باتیں اس شخص کی خصوصیات میں سے ہیں، جو اہل تجاذب میں سے ہوتا ہے اور

اگر اس میں قوتِ ملکی شدید ہو۔ اور اس کے ساتھ قوتِ بہیمی بھی شدید ہو۔
 زبانا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس طبیعت والے شخص کو کوئی عجیب سا
 واقعہ پیش آتا ہے، جس کی وجہ سے اس کا دل دنیا سے یکسر سرد ہو جاتا ہے
 اور اثرِ نقائے کی محبت اُس پر غائب آ جاتی ہے۔ یہ واقعہ خواہ کوئی خطرناک
 سانحہ ہو یا اُس نے کسی واعظ کا وعظ سنا ہو۔ یا اُس کی طرف کسی بزرگ کے
 نوحہ فرمائی ہو۔ بہر حال ان میں سے کوئی بھی چیز ہو۔ اس شخص پر اس واقعہ
 کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے اس کا دل کلیتہً اثرِ نقائے کی طرف
 متوجہ ہو جاتا ہے۔ مانتا اس اس شخص کی اس تعمیرِ حالت کو خرقِ عادت
 سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن اہل تجاذب میں سے جس شخص میں ملکی قوت تو شدید
 ہو، لیکن قوتِ بہیمی ضعیف ہو تو اس شخص کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ محسوس
 کرتا ہے کہ گویا کہ وہ ماورِ زادِ ولی ہے۔ اور یہ وصف خود اس کی اصل
 فطرت میں ودیعت کیا ہوا ہے۔ لیکن جوں جوں وہ جوان ہوتا ہے۔ اور
 اس میں طاقت آتی ہے تو اس شخص سے اور کمالات بھی ظاہر ہونے
 لگتے ہیں۔

منازلِ کمال کو طے کرنے میں اہل اصطلاح کا یہ حال ہے کہ وہ اس
 راہ میں بہت آہستہ آہستہ جیونٹی کی چال چلتے ہیں۔ اور کیا رنگی اُن میں
 کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ لیکن اہل اصطلاح میں سے جس شخص میں کہ قوتِ
 بہیمی شدید ہو، اس کا معاملہ دوسرا ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اہل تجاذب
 میں سے ہیں اور ملکی قوت اُن کی ضعیف ہے۔ اگر ان کی قوتِ بہیمی شائبہ

ہے تو جب وہ ریاضتیں کرتے ہیں یا کوئی قوی التوجہ بزرگ اُن پر اپنی تاثیر ڈالتا ہے۔ تو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خواب میں اور حالت بیداری میں افراد کو اپنے سامنے و رخشاں پاتے ہیں۔ یہی خوابیں دیکھتے ہیں۔ واقف کی آوازیں سنتے ہیں۔ اور ان پر الہامات ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ اس طرح پیش آتا ہے کہ اُن پر ان واقعات کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اور وہ اس میں غیر معمولی استقامت و صدق کا ثبوت دیتے ہیں۔ اگر عام لوگوں کو اس قسم کے افراد کی خبر ہو جائے تو وہ مددِ اُن کے مستند ہو جاتے ہیں۔

اہلِ تجاذب میں سے جن میں ملکی قوت ضعیف ہے۔ اور اُن کی ذہنی قوت بھی ضعیف ہے۔ ان پر زیادہ تر معنوی تجلیات اور نکات حقائق کو سمجھنے کی کیفیت غالب رہتی ہے اور اس ضمن میں جو کچھ ان پر وارد ہوتا ہے اس کا اثر ان کے دل پر کچھ زیادہ قوی نہیں ہوتا۔ بلکہ اُن کی ان اردات کی کیفیت ایسی ہوتی ہے گویا کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اور کبھی کبھی تو اُن کو اپنی ان واردات پر شکوک و شبہات ہونے لگتے ہیں۔ اہلِ تجاذب میں سے اس گروہ کی کیفیت یہ ہے کہ اگر عائدِ انیس ان کی کرامات سے واقف بھی ہو جائیں تو وہ کچھ زیادہ ان کے عقیدہ نہیں ہوتے۔

اہلِ اصطلاح میں وہ لوگ جن کی ملکی قوت خدید ہے، وہ انبیائے کرام کے علوم حاصل کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ ۱۰۰۱۱۱ کے

دشمنوں کو دیکھتے ہیں۔ اور عبادات کے اسرار، اقوام، اہل کی سیاست کے رموز، گھر بار اور شہروں کے نظم و نسق کے اصولوں اور اخلاق و آداب کے اسکی معاصصے وہ واقف ہوتے ہیں۔ اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی میں جو کچھ پیش آئے گا، انھیں اس کا بھی علم ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان کی ملکی قوت شدید نہ ہو تو خواہ وہ کتنی ریاضتیں کریں ان کو کرامات اور خوارق میں سے کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہوتی۔ ان میں شک نہیں کہ عبادات کے ضمن میں انھیں دعا و مناجات کی لذت ضرور محسوس ہوتی ہے۔ اہل اصطلاح میں سے اس طبیعت کے لوگ شریعت کے احکام کے پابند ہوتے ہیں۔ اور ان احکام کو بجا لانے سے انھیں اطمینان قناعت ہے۔ اور وہ ابھی پر خوش رہتے ہیں۔

فصلہ مختصر یہ ہے کہ دنیا میں بہترین رنگ وہ ہیں جو ملکی قوت سے بہرہ مندی سے۔ اب اگر یہ شدید ملکی قوت والے اہل اصطلاح میں سے ہوں تو یہ قوموں کی قیادت اور راست کے مستحق ہوتے ہیں اور اگر یہ اہل تجاذب میں سے ہوں گے تو علم الہیات کی شرح درجہائی کی ان کی زبان بڑی فصیح ہوگی۔ اور وہ لوگ جن کی بھی قوت شدید ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کے سردار و مقتدا بنتے ہیں۔ اور لوگ بھی ان کے مقتدا ہوتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کی قوت بھی ضعیف ہوتی ہے۔ انھیں دنیا میں کوئی نہیں جانتا۔ اور نہ وہ خلق میں زیادہ مشہور ہوتے ہیں۔

واقعیہ یہ ہے کہ شدید ملکی قوت والے لوگوں میں خال خال پیدا

ہوتے ہیں۔ اجنبی جن میں ملکی قوت ضعیف ہوتی ہے۔ وہ دنیا میں بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس طرح شدید بھیمیت والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اور جن کی بھیمیت ضعیف ہوتی ہے، ان کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔

اہل تجاذب میں سے جن کی ملکی قوت شدید ہو۔ اور ان کی بہیمیت بھی شدید ہو۔ ان کو وہ بے کے آئینے کی طرح سمجھئے کہ باوجود مسنت ہونے کے اس میں جلا ہوتی ہے۔ اور عقل کرنے سے اس میں نہایت منطکس ہو جاتی ہے لیکن اہل تجاذب میں سے جن کی ملکی قوت نو شدید ہو۔ اور قوت بہیمیت ضعیف ہو تو ان کی مثال ردی کے گالے کی جاتی ہے کہ اُسے پانی میں بٹوایا گیا ہو، اور اس میں سے پانی کے قطرے پید ہوتے ہیں۔

باقی رہے اہل تجاذب میں سے وہ لوگ جن کی ملکی قوت ضعیف ہے۔ اور ان کی بہیمیت قوت شدید ہے۔ تو ان کی مثال اس آئینے کی دہ ہے کہ اس کے اہل جہر کے اندر رنگ ہے۔ اب اگر آپ اُسے عقل کرنے میں خود غور متوکل چکنا ہے۔ لیکن کسی طرح بھی اس قابل نہیں ہوگا کہ اس میں صورت منطکس ہو سکے۔ لیکن اگر ان میں ضعیف ملکی قوت کے ساتھ ساتھ بھی قوت ضعیف ہے تو ان کی مثال اس بچے کی جاتی ہے کہ خواہ آپ اُسے کتنی بھی تعلیم دیں، وہ کچھ یاد نہیں رکھتا۔ اور وہ کسی چیز کا اعادہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس بچے کو ایک مدت حساب ہے

کہ جو چیزیں اُسے پڑھائی جا رہی ہیں۔ وہ ان کی صورتوں کو اپنے خیال میں جاگزیں کر سکے۔

جو شخص اہل اصطلاح میں سے ہے، اُس کے لئے عالمِ تجربہ و مبصرانہ ایک خوابِ فراموش کے ہوتا ہے۔ اور اگر وہ شخص شدید مکی قوت رکھتا ہے تو عالمِ تجربہ کے حقائق مناسب رتوں میں اس کے لئے متشکل ہوتے ہیں۔ اور اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عالمِ تجربہ سے الفاظ کے ذریعہ مکالمات کر سکتا ہے۔ اور اہل اصطلاح میں سے جس کی مکی قوت ضعیف ہوتی ہے اس کو عالمِ تجربہ کی کوئی چیز بھی متشکل نظر نہیں آتی۔

یہ ہے ایک مختصر سا بیان، بنی فرق انسان کی بعض امتدادوں کا۔ ان امتدادوں کو جاننے کے بعد یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اہل اللہ کے احوال و مقامات میں اکثر جو اختلافات دیکھنے میں آتے ہیں، دراصل اُن کی وجہ ان کی امتدادوں کا یہ مختلف ہونا ہے۔ چنانچہ اہل اللہ میں سے بعض بزرگ صاحب ارشاد ہوتے ہیں، اور وہ عامۃ الناس کو اپنی طرف مائل کریتے ہیں اور بحث و مناقشہ کے دوران میں یا بطور دعوت کے کرامات اور خوارق دکھاتے ہیں، اور ان اہل اللہ کی جماعت میں سے بعض ایسے بزرگ بھی ہوتے ہیں جو بالکل گمنام رہتے ہیں، نہ کوئی ان کو جانتا ہے، اور نہ کوئی انہیں پہچانتا ہے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ ان کی وجد و حال کی کیفیت ان کے ظہر سے قوی تر ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی کا وجد تو برے زور کا ہوتا ہے، اور بعض کو

معمولی سا وجہ آتا ہے۔ الغرض کسی پر دوسروں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ایک بار فقیر اس بات کو معلوم کرنے کے لئے عالم غیب کی طرف متوجہ ہوا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ پہلے زمانے کے ادبیاں بڑی تاثیرات اور عجیب عجیب قوجات کے مالک تھے۔ لیکن آج اس زمانے میں گو ارباب تصوف فریشت کے انھیں راستوں پر گامزن ہیں، اُن کو پہلوں کے ان کمالات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں تنبیہ اہل کی طرف سے مجھے بتایا گیا کہ عراقی گھوڑے اور فخر کو رکھو کہ دونوں کے دونوں ایک نوع سے ہیں۔ اور دونوں کی نشوونما بھی ایک ہی طرح سے ہوتی ہے۔ چنانچہ چھپین سے جب دونوں آگے بڑھتے ہیں، اور پھر وہ جوان ہوتے ہیں۔ اور جوانی کے بعد جب وہ بڑھاپے کی حد میں قدم رکھتے ہیں تو دونوں یکساں طور پر عمر کی ان منزلوں کو طے کرتے ہیں۔ اور کسی منزل میں بھی ایک دوسرے سے کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ان کے دانتوں کا گزنا، جامانی میں ان پر شہوانیت کا تاج، اور عمر کے دوسرے حصوں میں شہوانیت کا نہ ہونا، اور پھر جوانی میں ان کے مزاج کی خشکی اور تسکیدی اور بڑھاپے میں دونوں میں بلغم اور رطوبت کا پیدا ہو جانا۔ الغرض ان دونوں کو اپنی عمر کے ہر حصے میں ایک سے علامات میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور عمر کی ہر منزل میں دونوں کے قدم ایک ہی سے پڑتے

ہیں۔ لیکن اس کی انیت کے باوجود، اقی گھوڑے کو دیکھو
 کہ وہ کتنا تیز دوڑتا ہے۔ اور کس قدر مسافت طے کرتا ہے
 اس کے مقابلے میں فخر سے ان میں کوئی چیز بھی ممکن نہیں۔
 باقی اللہ ہر معاذ کو بہتر جانتا ہے۔

نئی نوع انسان کے لطائف

نیز کو بتایا گیا ہے کہ اثرِ قائلے نے انسان میں چند لطیفے و ودیعت فرمائے ہیں اور ان میں سے ہر ہر لطیفہ کی اپنی الگ الگ خاصیت ہے۔ مالک راہِ طریقت کو ملے کرتے وقت ایک لطیفے سے نرنی کر کے دوسرے لطیفے میں پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی سلوک کی منزل پوری ہو جاتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا نفس باطنیہ جب اُس کے جسم یعنی روح ہوائی سے پیوست ہوا اور اس جسم اور اس کی قوتوں کا اثر تمام بدن میں پھیلا۔ تو الاحوال اس سے چند صورتیں پیدا ہوں گی۔ ان صورتوں میں سے ہر ہر صورت میں جسم کا اثر الگ الگ ہوتا ہے۔ جسم کے اسی شعبے میں ہیں۔ اُن میں سے ایک قلب ہے۔ قلب نفس کی کیفیات و احوال مثلاً غصے، جرات، حیا، محبت، خوف،

انقباض، انبساط، رضا اور نفرت وغیرہ کا مرکز ہے اور اس کا صدر مقام سینے کے بائیں طرف پستان سے دو انچلے نیچے جے نیچے کے دوسرے شعبے کا نام عقل ہے۔ عقل علوم کی حامل ہوتی ہے۔ اور اس کی حدود اباں سے شروع ہوتی ہے، جہاں حواس کی مدغم ہوتی ہے۔ چنانچہ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو جن تک نہ انسان کی قوت احساس کی دسترس ہوتی ہے، اور نہ اُس کے دھم کی، وہ اُن کا تصور کر لیتی ہے۔ اور ان میں سے جس کی اُسے تصدیق کرنا ہوتی ہے اس کی تصدیق کرتی ہے۔ انسان کی عقل کا مرکز اس کا داغ ہوتا ہے نیچے کا تیسرا شعبہ طبیعت ہے۔ وہ چیزیں جن کے بغیر یا جن کی جنس کے بغیر انسان کی زندگی قائم نہیں رہ سکتی جیسے کہ کھانا، پینا، نیند اور شہوانیت وغیرہ ہیں۔ طبیعت انسان کے ان جلی تقاضوں کی حامل ہے۔ اور اس کا مرکز جگر ہوتا ہے۔

انسان پر اگر کبھی قوت کا غلبہ ہو جائے تو اس کا قلب غالب بھی بن جاتا ہے۔ اور قلب بھی سے مراد یہ ہے کہ انقباض و انبساط اور غصہ و دھماکیوں لطیف کیفیات قلب بھی داسے کے لئے لطیف نہیں رہیں۔ بلکہ وہ نفس مادی نفسانی لذتوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اور قلب بھی دالاکھی اس سے بھی نیچے اترتا ہے۔ چنانچہ اس حالت میں فیطانی دوسرے اس کو اپنا مرکب بنالیتے ہیں۔ اور اس کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ خارجی اسباب اور بیرونی اخراجات کے بغیر ہی کہا

کے دل سے طرح طرح کے خیالاتی دوسو سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کی حسب سے اس کی عقل اس حد تک ماؤف ہو جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ نفس کی ادنیٰ خواہشات کی طرف اکل رہتی ہے۔ اب اس شخص میں اگر شہوت کا غلبہ ہو گا تو نفسی طور پر اس کے دماغ میں جماع کے خیالات کثرت سے آئیں گے۔ اور اگر اسے بھوک ہو گی تو اس کا خیال انواع و اقسام کے کھانوں کا تصور کرے گا۔ اسی پر نفس کی دوسری خواہشات کا بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قلب پہنچے والا اس مقام سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ اور اس حالت میں وہ خیالاتی دوسو کو کھلے بندوں تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ کبھی اسے بچے نظام کو توڑنے کی فکر ہوتی ہے۔ اور کبھی یہ اعتقادات حقہ میں نلکھ پیدا کرتا ہے۔ غرضیکہ وہ اس طرح کے مفاسد میں اتنا گمراہ ہو جاتا ہے کہ اس کی طبیعت سر تا پا نفس مارہ بن جاتی ہے۔ اور پھر جو بھی اس کے جی میں آتا ہے، کرتا ہے۔ اور جس راہ پر چاہتا ہے، چل دیتا ہے۔ نہ اس کی عقل اس میں مانع ہوتی ہے اور نہ خیر کی کوئی قید اس کا راستہ روکتی ہے۔

اب ایک شخص ہے جس کی غلی اور بھی قوتوں میں ہم آہنگی ہے اور یہ دونو قوتیں آپس میں ایک ایسے مقام پر مل گئی ہیں جو طبیعت اور بہیمیت دونو کے بے بیج کی منزل ہے۔ ان دونو قوتوں کی ہم آہنگی کی وجہ سے اس شخص کے مزاج میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے

شخص کا قلب قلب انسانی کہلاتا ہے۔ اس شخص کی محبت، اس کا خوف اس کی رضا مندی اور اس کی ناراضگی۔ یہ سب چیزیں حقانیت پر مبنی ہوتی ہیں۔ یہ شخص دوزخ سے ڈرتا ہے۔ بہشت کی اسے تمنا ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اسی طرح اُس کی دوسری باتوں کا قیاس کر لو۔

جس شخص میں قلب انسانی ہوتا ہے، اُسے مجاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ مجاہدے کے ذریعے سے دل کو غفلت سے باز رکھ سکے۔ وہ شخص جس کا قلب قلب بھیجی ہے۔ اس کا نفس نفسِ امارہ ہوتا ہے۔ لیکن قلب انسانی واسطے کا نفس، نفسِ تامہ ہوتا ہے۔ اس شخص کے نفس کی مثال یوں سمجھئے جیسے کہ ایک سرکش گھوڑا ہو۔ اور اُس کو گھام کے ذریعہ قابو میں رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس شخص کی عقل عقلِ عقلِ انسانی کہلاتی ہے۔ چنانچہ یہ سر اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جس کی کہ تصدیق کرنی چاہیے۔ اور تصدیق ہی کی کیفیت اس شخص کے جملہ احوال و کوائف پر غالب رہتی ہے۔

”قلب انسانی، نفسِ تامہ اور عقل انسانی“ کا مقام نیکو کلاموں اور علمائے دین کا ہے۔ اور احکامِ شریعت کا عمل و فعل اس مقام کے لوازم میں سے ہے۔

جس شخص میں ملکوتی قوت کا زور ہو۔ اور اس کے مقابلے میں اُس کی یہی قوت اس طرح زیر ہو جائے، گو یا کہ اُس کا کہیں وجود نہ تھا۔

تو اس شخص کا قلب "روح" بن جاتا ہے۔ اس مقام میں اُسے مجاہد اور ریاضتوں سے نجات مل جاتی ہے۔ چنانچہ قبض کے بغیر اُسے بطن کی کیفیت سر آتی ہے۔ قلع و اضطرار کے بغیر وہ الفت و محبت سے بہرہ یاب ہوتا ہے اور بے ہوش ہوئے بغیر اُسے وجد آتا ہے اور اس طرح اس شخص کی عقل ترقی کر کے سر بن جاتی ہے عقل جب "ستر" کی منزل میں پہنچتی ہے تو وہ غیب سے بلند مرتبہ علوم و معارف کو حاصل کرتی ہے۔ لیکن اس کا ان علوم کے حصول کا طریقہ وہ نہیں ہوتا، جو عام طور پر جاری و ساری ہے۔ یعنی یہ کہ فراست سے کوئی بات معلوم کر لی یا کثرت سے کسی علم کو حاصل کر لیا، یا بات سے کوئی بات سُن لی۔ چنانچہ وہ شخص جس کی عقل "ستر" بن جاتی ہے، وہ مقام بے ثنائی کو اپنا نصب العین بناتا ہے۔ اس شخص کا نفس "نفس مطمئنہ" ہوتا ہے کہ خسر و عقل کی مرضی کے خلاف وہ کسی خواہش کا خیال تک نہیں کرتا اور اس کے دل میں جو خیالات اُٹھتے ہیں، وہ بھی سراپا مستقیم کے مطابق ہوتے ہیں۔ بانی اس شخص کے اعمال کا تو کیا کہا ہی ولایت صغریٰ کا مقام ہے۔

ولایت صغریٰ کے بعد اگر عنایت الہی اس شخص کے جس کا نفس "نفس مطمئنہ" قلب، روح اور عقل ستر ہوئی ہے، شامل حال رہے تو اُسے آگے اور ترقی کرنا ہے، چنانچہ یہاں سے اُس کے سامنے دو راہیں کھلتی ہیں۔ ایک ولایت کبریٰ کی راہ، اور دوسری حقیت کی

راہ۔ حقیقت کو نورِ نبوت اور درخشِ نبوت کا بھی نام دیا گیا ہے۔
 ولایتِ کبریٰ کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان نسو اور اس کے
 متعلق قوتوں کو اپنے آپ سے الگ کر دے۔ لیکن اس ضمن میں یہ طوطہ
 رہے کہ نسو اور اس کی متعلق قوتوں کو اپنے آپ سے مہمانی طور پر الگ
 کرنا ممکن نہیں ہوتا، بلکہ علیحدگی کا یہ عمل صرف بصیرت اور محالِ وحییت
 ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جب انسان نسو اور اس کی متعلق
 قوتوں کو اپنے آپ سے الگ کر دے۔ اور اس کے بعد وہ اپنے آپ
 میں غور کرے اور اپنے باطن کی گہرائیوں میں ڈوب جائے تو اس حالت
 میں نفسِ کلیہ جو کل کائنات کی اصل ہے، اس شخص پر شکست ہو جاتا ہے
 ۔ نہیں یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر نفسِ کلیہ ہی نفس پر کیسے شکست ہو گیا؟
 بات یہ ہے کہ انسان میں جو نفسِ ناقص ہے، وہ اصل میں نفسِ کلیہ
 کے نشانات میں سے ایک منزلی اور اس کے ظہورات میں سے ایک جلوہ
 ہے۔ چنانچہ جب انسان کا نفس ناقص سب چیزوں سے پورا انقطاع
 کر کے اپنے مطلق غور کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو جاننے اور اپنی اصل
 تک پہنچنے کے لئے نیچے کی طرف جاتا ہے، وہاں سے کہ اس کے وجود کی
 نو ہوئی تھی۔ تو وہ اپنے سامنے نفسِ کلیہ کو پا جاتا ہے، جو کائنات میں ہر
 جگہ جاری و ساری ہے۔

عام اہلِ اقدار نے اس نفسِ کلیہ کا نام وجود رکھا ہے اور کائنات ہی
 اس کے ہر جگہ جاری و ساری ہونے کے علم کو وہ معرفتِ سرِ باطن وجود

کہتے ہیں۔ اور انسان کا نفس ناطقہ سب قسم اور اس کی متعلقہ قوتوں کے اثرات سے پاک اور خالص ہو کر نفس کلیہ کے ساتھ اپنا احکام قائم کر رہا ہے تو نفس ناطقہ کو اس خاص حالت میں "خفی" کا نام دیا جاتا ہے۔

فقیر کو بتایا گیا ہے کہ ولایت کبریٰ کے حصول کا سب سے قوی ذریعہ یہ ہے کہ جب سالک پر مقام بے نقاتی تکشف ہو جائے تو پھر وہ مراقبہ احاطہ یعنی ان اشعار علی کل شیء محیط کا مراقبہ کرے بھلاؤں! "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا ذکر کرے۔ لیکن یہ ذکر کرنے وقت وہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کے ضمن میں "لا موجود الا اللّٰہ" کے مفہوم کو ملحوظ نظر رکھے۔

مغنیّت کی حقیقت یہ ہے کہ جب نفس ناطقہ قسم کی غیر لطیف قوتوں سے اعراض کر رہا ہے، تو وہ علامتوں سے محض ہو جاتا ہے۔ اور اس حالت میں نفس ناطقہ میں وہ علمی صورتیں تکشف ہو جاتی ہیں جو علامتوں میں بھڑھوتی ہیں۔ اور اس طرح انسان کا نفس ناطقہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ واجب الوجود کی معرفت کو ان معنوں میں کہ اس ضمن میں قدرت خداوندی کے جملہ کمالات از مضم ابدوع جلیق تدبیر اور ربّی کا علم بھی آجاسکے اجمالی طور پر حاصل کر سکتا ہے۔ مقام مغنیّت کی ان خصوصیات ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ افراد کا دل جن کو یہ مقام عطا ہوتا ہے، ان کے کلام میں تشبیہات کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ گو تشبیہات کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ان کے کلام میں تشریحی پہلو بھی ملے ہوتے ہیں۔ اور نیز ان لوگوں کو نوامیس ایسی بھی اللہ تعالیٰ کے شراخ و قواعد کے احکام کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اور

خفیہ و القدس میں سننے نئے حالات کے مطابق جو فیصلے ہوتے ہیں یہ لوگ اُن سے بھی! خبر رہتے ہیں۔

ہم ابھی بیان کر آئے ہیں کہ ولایت صغریٰ کے مقام سے ساکب جب ترقی کرتا ہے، تو اس کے سامنے دو مقام آتے ہیں۔ ایک ولایت کبریٰ کا مقام اور دوسرا مقام مہبیت۔ اور مہبیت کو نور نبوت اور خدا نبوت بھی کہتے ہیں۔ جہاں تک اصل نبوت کا تعلق ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ نبوت دو جانب سے معرض وجود میں آتی ہے۔ اس کی ایک جانب تو نبوت قبول کرنے والے کی ہوتی ہے، یعنی نبی کے نفسِ ناطقہ کی چنانچہ نفسِ ناطقہ جب مقام مہبیت کو حاصل کر لیتا ہے، تو نبوت کی ایک مشرہ یا ایک جانب پوری ہو جاتی ہے، اور نبوت کی دوسری جانب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کا مبعوث ہونا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی تدبیر اس امر کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کے اہمال و غفلت سے ڈراتے، ان کو توبہ و ایمان کی طرف بلاتے۔ اُن میں مفاسد و نظام کو دور کرنے اور اس قبیل کے دوسرے امور کو سرانجام دینے کے لئے کسی شخص کو مبعوث کرے تو اس طرح نبوت کی دوسری شرط یا دوسری جانب بھی پوری ہو جاتی ہے۔ فرض نبوت دو امور سے ترکیب پاتی کہ ایک نبی کے نفسِ ناطقہ کی ذاتی صلاحیت، اسی کا نام مہبیت ہے اور اس کو نور نبوت اور وراثت نبوت کہنے کی جی بھی دبو ہے۔ اور دوسری چیز اللہ تعالیٰ کا کسی شخص کو نبی مبعوث کرنے کا ارادہ ہے۔

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد گو نبوت ختم ہو گئی۔ لیکن اجزائے نبوت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اجزائے نبوت سے یہاں مراد مہفیت سے ہے۔ جس کا کہ سلسلہ اب تک منقطع نہیں ہوا۔ چنانچہ وہ بزرگ جو مقام مہفیت پر سرفراز ہوتے ہیں۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے نائب کی حیثیت سے دین کی تجدید فرماتے ہیں۔ نیز وہ سلوک و طہارت میں ارشاد و ہدایت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں، اور جو بُرائیاں لوگوں میں پھیلی ہوتی ہیں، اُن کا وہ سدباب کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو حالات و اسباب اس امر کے متقاضی ہوتے ہیں کہ ایک نئی دنیا میں مبعوث ہو، بعینہ اسی طرح کے حالات و اسباب ان افراد مہفین کے ظہور کا بھی تقاضہ کرتے ہیں کہ وہ نئی کے بعد آئیں اور اُن کے دین کی تجدید کریں اور سلوک و طہارت کی طرف لوگوں کو ہدایت دیں اور مفاسد کا قلع قمع کریں۔

افراد مہفین کی اس جماعت میں سے جو فو کی ہوتے ہیں وہ تو منصب مہفیت کے اس سمر کو سمجھ لیتے ہیں۔ اور جو فو کی نہیں ہوتے، ان کو تدبیر الہی ٹکڑی اور پتھر کی طرح ایک حالت سے دوسری حالت میں برابر بکر دیتی اور رد و بدل کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ قدرت کو جو کام اُن سے لینا مقصود ہوتا ہے، وہ اُسے سرانجام دے دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ایک صورت عالم مثال میں موجود تھی۔ آپ جب مبعوث ہو گئے تو نبوت کی یہ مثالی صورت بھی منتشر ہو گئی۔

اور، اس طرح نبوت کی حقیقت اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ گروہ اور کوئی بنی نہیں آئے گا۔ لیکن افراد متفہمین پر جن چیزوں کا فیضان ہوتا رہا ہے، وہ سب نبوت ہی کے انوار اس کی استسباح اور تفسیل میں ہیں۔ چونکہ طریقت اور سلوک کے صرف اُن پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے جن کا تعلق سالک کے ارادہ و قصد اور اس کے عبادت سے اور ریاضت سے ہے۔ اسی لئے مقامِ فردیت کے اُن کمالات کا بیان کرنا جو سرتاپا وہی ہیں، اور سالک کے قصد و ارادہ کا اُن میں مطلق دخل نہیں یہاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔

آئندہ شے باید و خوش ماہتابے تا با تو حکایت کنم از ہر باجے
خلاصہ مطلب یہ ہے کہ انسانی لطائف یعنی لطیفہ قلب، لطیفہ عقل اور لطیفہ طبیعت کے درجہ ترقی کو سمجھنے کے لئے اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ راہ سلوک کے جن مقامات اور احوال کا ہم ابھی ذکر کر رہے ہیں، ان کو پیش نظر رکھا جائے۔ اور پھر اہلِ شریعت کے وہ معاملات اور واقعات جو ان احوال اور مقامات پر واقع کرتے ہیں۔ وہ بھی ملحوظِ خاطر رہیں۔ اس ضمن میں انسانی لطائف کو سمجھنے کے لئے کیفیات و احوال اور اس قبیل کی اور چیزوں کو جاننے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر بعد کے صوفیاء کہتے ہیں۔

آخر میں ہم اس امر کی بھی وضاحت کر دیتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کہ تترِ مقدم ہے روح سے یا روحِ مقدم ہے، بہتر سے صوفیائے تقدیر ہیں

اختلاف رہا ہے۔ "ستر" اور "روح" دونوں کا آپس کا تعلق یوں سمجھئے جیسے
 کہ گھوڑ دوڑ میں دو گھوڑے دوڑ رہے ہوں۔ اور دونوں ہم غاں اور
 برابر ہوں۔ ان میں سے کبھی ایک اپنی استعداد کی وجہ سے آگے
 بڑھ جائے، اور دوسرا اُس کے پیچھے پیچھے آئے۔ اور کبھی دوسرا آگے
 بڑھ جائے۔ اور پہلا اُس کے پیچھے پیچھے آئے۔

اصحابِ امین

اس فقیر کو بتایا گیا ہے کہ سلوک الی اللہ کی دو قسمیں ہیں۔ اس کی ایک قسم تو وہ ہے کہ شرعی احکام و اوامر کی پابندی کا اس پر بھاری و قیام ہے۔ اور سلوک کی اس قسم کی تبلیغ و دعوت اللہ تعالیٰ نے علماء پر جو انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، فرض کی ہے۔ اور اسی کے متعلق یہ حکم ہے کہ اگر علماء اس فرض کو پورا نہ کریں، اور دعوت الی الحق کو چھپائیں تو اس پر ان سے مواخذہ کیا جائے گا۔ سلوک الی اللہ کی یہی وہ قسم ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی سنت میں بڑی وضاحت کی گئی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کتاب سنت پر عمل کرتا ہے، اور جو ضروری اور اود و وظائف ہیں ان کا وہ پابند ہے۔ اور اس کی اصل فطرت میں دجالیست نہیں ہے تو ضروری ہے کہ ان اعمال کی وجہ سے جو وہ بچا لاتا ہے، ”اصحابِ امین“ کی راہوں میں نہ

ایک راہ اُس کی حسب اعتقاد اس کے سامنے کھلے سلوک الی اللہ کی اس راہ پر چلنے والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو اس ایک راہ کے علاوہ دوا دوسے زیادہ راہیں دی گئی ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن میں سے اکثر کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ وہ ایک عمل کی برکت سے یا ایک مصیبت میں پڑنے کی وجہ سے نجات پا گئے۔

سلوک الی اللہ کی دوسری قسم وہ ہے کہ جن لوگوں کی طبیعتیں اور مزاج عالی ہوتے ہیں، وہ محض اپنی افتاد فطرت سے سلوک کی اس دوسری قسم کی طرف ہدایت حاصل کر لیتے ہیں اور ان لوگوں کا خدا تعالیٰ خود کفیل اور کار ساز ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی تدبیر سے کوئی نہ کوئی ایسی غریب ضروریہم فرما دیتا ہے کہ ان تک دانی و حکمت جو حکیم کی اپنی گم شدہ متاع ہوتی ہے پہنچ جائے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ وہ لوگ جو نفوس ناقصہ رکھتے ہیں، یعنی جن کی ملکی قوت ضعیف ہوتی ہے۔ خواہ ان کی اپنی قوت شدید ہو یا ضعیف۔ اور وہ اہل تجاذب میں سے ہوں یا اہل اصطلاح میں سے۔ بہر حال ان نفوس ناقصہ میں بعض عجیب باتیں پائی جاتی ہیں۔ اور گواہی ان کی اکثریت ان کی طرف انکسالت نہیں کرتی، اور نہ وہ ان کو کسی شمار میں لاتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمہور عوام تو آخر یہی نفوس ناقصہ دیکھے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے علمائے متبحرین اور خود شاربِ علیہ الصلوٰۃ والسلام

کی نظر اوروں سے زیادہ اپنی لوگوں کے احوال پر ہوتی ہے چنانچہ ان لوگوں ہی کے حالات و مقامات کو زیادہ حوصلے رکھتے ہیں۔ اور ان کو زندگی میں جو عوارض اور حوادث پیش آتے ہیں، علمائے شجرین اور شارب علیہ الصلوٰۃ والسلام بیشتر انہی کی وضاحت فرماتے ہیں۔

ان عہدِ عوام میں سے اکثر تعداد اصحاب ہیں کی ہوتی ہے۔ اور اصحاب یہین کے بھی بہت سے طبقے ہیں۔ ہم اس قسم میں ان میں سے بعض کا ذکر نمونے کے طور پر یہاں کرتے ہیں۔ اب جن کا ذکر کیا جا رہا ہے ان پر دوسروں کو قیاس کیا جاسکتا ہے، جن کا کہ ہم یہاں ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

دالغ (۱) ان میں سے پہلا طبقہ وہ ہے جو ساجتین کا مقلد اور ان کی تخیل ہے۔ ان ساجتین میں سے ایک مقامِ فردیت رکھنے والوں یعنی مفردین کا گروہ ہے۔ مفردین وہ لوگ ہوتے ہیں، جن کی نظر تمامِ عالم غیب کی طرف رمتی ہے۔ اور جب وہ ذکر و ذکر کرتے ہیں تو ان کے دل میں عالم غیب کی طرف ایک کشارہ اور وسیع راہ کھل جاتی ہے چنانچہ اصحاب یہین میں سے نیک طبقہ ان مفردین کا مقلد اور ان کی تخیل ہوتا ہے اس طبقہ کی یہ حالت ہے کہ کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ذکر و ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ کی عام رحمت کی طفیل یا اس کے برگزیدہ بندوں میں سے کسی کی برکت سے ان اصحاب یہین کو مفردین کی کیفیت میسر آتی ہے اور ہر تھوڑی دیر کے بعد ان سے یہ کیفیت مفقود ہو جاتی ہے۔ لیکن ان لوگوں سے اس کیفیت کے مفقود ہونے کے بعد یہ نہیں ہوتا کہ ان کے دل

پر ایسے احوال طاری ہو جائیں، جو پہلی کیفیت سے متضاد ہوں۔
 اصحابِ یمن کی ایک جماعت صدقین کی مقلد اور مثال ہوتی ہے
 اور صدقین وہ لوگ ہیں جو دین کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس میں
 مدد و رجحانات و اشتغال رکھنے کی وجہ سے سب مسلمانوں میں ممتاز
 ہوتے ہیں۔ صدقین کے اس وصف کمال کو یوں سمجھئے جیسے کہ مار اعلیٰ کا
 ایک پرتوان کے دلوں میں جاگزیں ہے، اور اسی کی وجہ سے اُن کو
 دین میں اس قدر خبات اور اشتغال حاصل ہے۔ ان فرضِ اصحابِ یمن
 میں سے جو لوگ ان صدقین کے مقلد ہوتے ہیں، وہ احکامِ دین کے
 معاملے میں بڑے فرمانبردار ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے اس فرمانبرداری
 کے رجحان کو بظہر تحقیق دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی یہ فرمانبرداری
 دین و دوا سبب پر مبنی ہے۔ اس کا ایک سبب تو ان کا اپنا ایمان
 و یقین ہے۔ اور ان کی اس فرمانبرداری کا دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ
 لوگ دینی اعمال کو اس حد تک بجا لاتے ہیں کہ آخر میں یہ اعمال ان کے
 کے لئے بطور ایک عادت کے بن جاتے ہیں۔ اور ان اعمال کی وجہ سے
 وہ اپنے آپ کو اپنے اسلاف کی راہ پر چلتے ہوئے پاتے ہیں۔ چنانچہ
 یہ اور اس طرح کی اور بھی باتیں ہیں۔ جو ان لوگوں میں احکامِ دین کی
 فرمانبرداری کا رجحان پیدا کرتی ہیں۔ یہ شک ان کی فرمانبرداری کے
 یہ دوا سبب ایک سے نہیں ہیں۔ اور ان دونوں میں ایک دوسرے
 سے فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن علما ان دوا سبب کا الگ الگ ہونا کوئی

نقصان نہیں دیتا۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک سبب ان لوگوں کے اس جوہر روح میں جو کیفیت پیدا کرتا ہے، وہ اس کیفیت سے جو دوسرے سبب پیدا ہوتی ہے مختلف نہیں ہوتی بلکہ دونوں کیفیات باہم ملی جلی ہوتی ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کا تفرقہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ الغرض اصحاب یمن کی یہ جماعت جب اس دنیا سے انتقال کر کے دوسری دنیا میں پہنچی ہے تو وہاں بھی یہ لوگ فراخ رواری و رخی و رین کی اس صفت کو جو اس دنیا میں انہوں نے حاصل کی تھی اپنے اندر موجود رکھتے ہیں۔ اور اس سے وہ مستفید ہوتے ہیں۔

اصحاب یمن کا ایک طبقہ شہدا کا مقلد اور ان کی مثال ہوتا ہے اور شہدا کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ کفار پر شدید اور مومنین پر رحم ہوتے ہیں وہ برائیوں کو سختی سے روکتے ہیں اور اعلیٰ کلمۃ الحق سے انھیں بڑی رغبت ہوتی ہے۔ شہدا کے نفوس میں ان سب خصوصیات کا انبیاء عظیم اسلام کے دلوں اور خیر ملا راسخے سے فیضان ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ان کاموں میں بڑے ثابت قدم اور ان کے بے حد پابند ہوتے ہیں۔ اصحاب یمن کے اس گروہ کو ایمان کے ساتھ ساتھ طبیعت کی بے قراری اور اضطراب اور مزاج کی تندی اور سختی بھی ودیعت ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ برائیوں کو مٹانے اور کفر کے لشکروں کو پا ال کرنے میں بڑے کوشاں اور سرگرم رہتے ہیں یا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے مزاج میں فطری طور پر جذب کی کیفیت مرکوز ہوتی ہے اور یہ کیفیت

جذب اُن کے ایمان سے مخلوط ہو جاتی ہے چنانچہ جذب اور ایمان کی یہ مخلوط کیفیت جو ان کے اندر جاگزیں ہوتی ہے وہ انہیں اس امر پر ابھارتی رہتی ہے کہ وہ مخلوق اور کافروں سے مناظرے کریں۔ اور ان کے غائب باطلہ کے خلع قلع میں کوشاں ہوں۔

اصحابِ یمن میں سے ایک جماعت راہنہین فی العلم کی مقلد اور اُن کی مثال ہوتی ہے۔ اور راہنہین فی العلم وہ لوگ ہیں کہ عالمِ غیب سے اُن کے باطن میں بغضِ وہد کا سلسلہ برابری جاری رہتا ہے۔ اور اس کی مدد سے کتاب اللہ اور سنت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معانی پر اس طرح آکھابی حاصل کرتے ہیں، گویا کہ پرزے کے پیچھے سے کوئی انہیں سب عقائد کی خبر دے رہا ہے۔ اصحابِ یمن کا وہ طبقہ جو ان راہنہین فی العلم کا مقلد ہوتا ہے، وہ بیشتر کتاب و سنت کے علوم اور مدار کے اقوال و اخبار کی حفاظت میں اٹھنا رکھتا ہے۔ بے شک ایک حد تک ان لوگوں پر کتاب و سنت کے معانی کا رد و اذہ بھی کھلتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں جو کچھ انہیں پہل ہوتا ہے، وہ سب کا سب ان کے صرف ذاتی غور و فکر اور اپنے حفظ و احاطہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انہیں جب یہ لوگ دوسری دنیا میں پہنچتے ہیں، اور وہ عالمِ جوارہ فحاشی کی طرف منسوب ہیں، وہ اس دنیا میں ان لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان علومِ الہی کا لب باب اُن کے باطن میں ایک اجلی کیفیت کی شکل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ اور اس ذہنی کوئی تپ راہنہین فی العلم کے مقام کا ایک رُخ بے نقاب ہوتا ہے۔

صحابہ یمن کی ایک جماعت عبادِ مطہرین کی تقلید اور ان کی تقلید
 ہوتی ہے۔ اور عبادِ مطہرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو نورِ عبادت اور نورِ طہارت
 کا جن کا ذکر ہم پہلے کرتے ہیں، کثرت سے ادراک کرتے ہیں اور اس وجہ
 سے ان کو تمام مسلمانوں میں خاص طور پر امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ صحابہ
 یمن کی اس جماعت کی خصوصیت یہ ہے کہ طہارت اور عبادت کی جو
 مختلف صورتیں اور شکلیں ہیں، اس جماعت کے لوگوں کو ان میں سے کسی
 ایک صورت اور شکل سے مدد و رہبر کی حاجتگی اور حاجت ہوتی ہے
 چنانچہ عبادت یا طہارت کی اس خاص شکل کے ذریعہ ہی وہ اپنے مقصود
 کو بھی پا لیتے ہیں، اور اس کی وجہ سے طہارۃً وہ اس بات کے عادی ہو جاتے
 ہیں کہ اس خاص شکل کے علاوہ عبادت اور طہارت کی دوسری
 شکلوں اور صورتوں سے بے توجہی برتیں۔ مثلاً ایک شخص بے حس نے صبح
 کو نماز فجر کے لئے دھنوکیا۔ اس وقت وہ بول و براز اور ریح سے فارغ
 ہو چکا تھا اور اس کی قسم کی پریشانی خیالی یا اور کوئی تشویش بھی نہ تھی، جو اس کی
 توجہ میں خلل انداز ہوتی، اس حالت میں یہ شخص دھنوکے ذریعہ کسی حد تک
 نورِ طہارت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ گو یہ شخص طہارت اور عبادت کے
 دوسرے اعمال بھی بجا لاتا ہے، لیکن جو کیفیت اُسے دھنوکے حاصل
 ہوتی ہے، وہ کسی اور چیز سے میسر نہیں آتی۔ اسی طرح ایک اور شخص ہے
 جس نے کسی موقع پر کوئی خاص ذکر یا ذکر کیا یا کسی مخصوص طریقے سے
 اُس نے کوئی مناجات کی۔ یا اُس نے نمازوں میں سے کوئی نماز پڑھی۔

اور اس سے اُس کی توجہ کلیتہً سب چیزوں سے ہٹ کر صرف اسی غما
 ذکر، یا مناجات یا اس نماز کی طرف ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے
 اس خاص ذکر، مناجات یا نماز کی کسی بزرگ سے تعریف سُنی ہو۔ اگرچہ
 یہ بات ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہو۔ بہر حال اس
 ذکر، مناجات یا نماز کا اس پر یہ اثر ہوا کہ اُسے اس میں نورِ عبادت کی
 کیفیت حاصل ہو گئی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس زندگی میں تو
 اصحابِ بہین کی اس جماعت کو صوم و صلوٰۃ سے کوئی نورِ میسر نہیں ہوتا۔
 لیکن ان کی وجہ سے ان میں اس نور کو حاصل کرنے کی حقارتی بہت متولد
 ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یہ لوگ جب اس دُنیا سے دوسری دُنیا
 میں پہنچے اور وہاں ان کے نفوس نے عالمِ تجرد کی بو سونگھی تو اُن
 کے اندر صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے اس دُنیا میں نورِ عبادت کو حاصل کرنے
 کی جو محضی استعداد پیدا ہو گئی تھی، وہ یہاں دوسری دُنیا میں اُن
 کے کام آئی۔ اور دنیاوی زندگی میں انہوں نے جو نیم پختہ ریاضت کی
 تھی، اُس نے یہاں اُن کو نفع پہنچایا۔

اصحابِ بہین کا ایک گروہ "اصحابِ خلقِ حسن" کا مُتعلقہ اور ان کی
 مثال ہوتا ہے۔ اور خلقِ حُسن والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو جوہر و سخاوت
 انکسار و تواضع، عفو و بشارت، اور عامۃً خلائق کی نفع رسانی کی وجہ
 سے امتیاز رکھتے ہیں۔ اصحابِ بہین میں سے جو گروہ ان اصحابِ خلقِ حسن
 کی مثال ہوتا ہے، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جہلی طور پر نرم مزاج

واقعہ ہوتے ہیں۔ اور زمی کے اظہار میں انہیں کسی قسم کا باک بھی نہیں ہوتا۔ نیز وہ اچھے کاموں کو غلو میں نسبت سے سراجام دیتے ہیں۔ اور ان کی باتوں کو کرتے وقت ان کے پیش نظر عمومی اور ملکی اصول ہوتے ہیں۔

صحابہ یمن کی ایک جماعت زبَاد کی تقلد اور ان کی مثال ہوتی ہے۔ اور زبَاد کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عالم عقی و عدا میں بہت باؤ یقین رکھتے ہیں۔ اور اس معاملہ خاص میں باقی تمام مسلمانوں پر انہیں امتیاز ہوتا ہے۔ زبَاد دنیا کی تمام لذتوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور اُن کے نزدیک دنیا، اہل کی کوئی اہمیت ہوتی ہے، اور نہ وہ اُن کے طور طریقوں اور رسم و رواج کی کچھ پروا کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زبَاد کی روح یا اُن کا سراسر عالم عقل کی طرف ہیستہ مائل رہتا ہے، اس لئے دنیا کی کوئی چیز ان کی نظروں میں نہیں جھٹی سہا ہے جس سے وہ لوگ جو ان زبَاد کے تقلد اور اُن کی مثال ہوتے ہیں، ان میں زبرد و تعبد کے ساتھ ساتھ طرز معاش کی کرخنگی، طبیعت کی سختی اور اس طرح کی اور باتیں جمع ہوتی ہیں۔ چنانچہ جو اعمال و افعال زبَاد کرتے ہیں۔ یہی کچھ ان لوگوں سے بھی صادر ہوتا ہے۔

صحابہ یمن کے پہلے جیسے کے مختلف گروہوں کا بیان یہاں ختم ہوا۔ اب، صحابہ یمن کا دوسرا طبقہ وہ ہے جس نے اویار اللہ کی نسبت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور گو وہ اپنے مزاج کے ضعف کی وجہ سے یا کثرت ذہن ہونے کی بنا پر یا پوری ریاضت نہ کر سکنے کے

سبب سے اولیاء اللہ کی اس نسبت کو تو حاصل نہ کر سکا۔ لیکن اس نسبت سے انہیں مناسبت ضرور پیدا ہو گئی۔ اب اصحاب میں کے اس طبقے میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے محض درود و صلوة کے ذریعہ اویسی نسبت حاصل کر لی۔ اور ان پر اس بارگاہ سے انس و سرور کا فیضان ہو گیا یا وہ کسی اور طریق سے اس ذات گرامی کے سرور عنایت ہو گئے۔ اور ان میں سے دوسرا گروہ امن لوگوں کا ہے جو بعض قبروں کی برابر زیارت کرتے اور ان پر فاتحہ پڑھتے رہتے یا انہوں کے کسی بزرگ کے نام کا صدقہ دیتے دیتے اس بزرگ کی روح سے مناسبت پیدا کر لی۔ پھر اس کے کردہ نسبت اویسی کے اصول و فروع سے گماختہ واقف ہو گئے۔

اولیاء اللہ کی نسبت سے مناسبت حاصل کرنے والے اصحاب میں سے تیسرا فرقہ ان لوگوں کا ہے جو ایسے اشغال اور اس قسم کی توجہات میں لگ گئے جن سے کہ نسبت یا دوستی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ان اشغال اور توجہات کے ضمن میں ہی ان کو اطمینان خاطر نصیب ہو گیا، گو یہ لوگ اچھی نسبت یا دوستی کی اصل حقیقت سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ ان اصحاب میں سے جو تھانہ فرقہ ان لوگوں کا ہے جن کو نسبت یا دوستی رکھنے والوں کی صحبت نصیب ہوئی اور محض ان کی صحبت کی برکت سے ان کو دعا و مناجات کی طاقت سیر آگئی۔ اور ان کا پانچواں گروہ ان لوگوں کا ہے جن کو شاعرانہ

میں سے کسی ایک سے یا اللہ کی محبوب چیزوں میں سے کسی سے مثلاً قرآن مجید سے یا کعبہ منظر سے عشق ہے۔ چنانچہ وہ بڑے شوق سے قرآن عظیم کی تلاوت کرتے ہیں اور کعبہ منظر کی تعظیم اور اس کے طواف میں بڑا جہانم کرتے ہیں۔ با پھر یہ ہوتا ہے کہ اس گروہ و احوں کو اذیہ بسیار اللہ میں سے کسی دنی سے خالص محبت ہوتی ہے۔ اور وہ اس محبت میں "خانی ایضاً" ہو جاتے ہیں چنانچہ اسی گروہ میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے نسبت توحید کے حصول کا قصد کیا۔ اور گو وہ اس نسبت کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکے۔ لیکن انہوں نے اپنے فکر کی سلامتی اور اپنے اعتقاد کی صحت پر ہتھے ہوئے علم توحید کو گرفت میں لانے کی ایک حد تک کوشش ضرور کی۔

(ج) اصحاب یمن کا تیسرا طبقہ اُن لوگوں کا ہے، جو خود اپنے ارادے یا قصد سے تو راہِ سلوک اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ ایک وقت ان پر ایسا آتا ہے کہ اُن کی طبیعت میں ایک رجحان پیدا ہو جاتا ہے جو ان کو خود بخود اس راہ پر ڈال دیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص مسلمان ہے اور گو وہ اسلام کے تمام ارکان بجا لاتا ہے لیکن اسلام سے آگے "اسان" کی جو منزل ہے اس شخص کی توجہ اس کی طرف بالکل نہیں جاتی، اور مسلمان ہونے کے باوجود اور اسلام کے تمام ارکان ادا کرتے ہوئے اس کی طبیعت میں سختی رہتی ہے۔ اس دوران میں وہ ایک سخت حادثے سے دوچار ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کسی مُرضی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس مرض کے دنوں میں رفتہ رفتہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص پر ظلم و سفل کا ایک دردازہ ٹھل جاتا ہے یا خود اس کے اندر

طہار سافل کی یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ بیماری کی حالت میں عجیب عجیب واقعات دیکھتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص فقر و فاقہ، ذلت و ناکامی یا اولاد و عزیز و اقارب کے نعمات کا نشانہ بنا۔ اور گو شروع شروع میں وہ بہت رویا پیشا، اور بڑی آہ و زاری کی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تو پچھلے دل سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور اس کی جناب میں اس نے بڑی بڑی کیس کی اس شخص کے دل میں دُنیا اور دُنیا والوں سے فی الجملہ نفرت پیدا ہو گئی۔ (۲) اصحابِ یحییٰ کا جو تعاطف اُن لوگوں کا ہے کہ کسی فطری کمزوری کی وجہ سے اُن کے لطائفِ سگاند یعنی اُن کے لطیفِ قلب، لطیفِ عقل اور لطیفِ طبع میں آپس میں عیبی کہ ہم آہنگی اور مناسبت ہونی چاہیے۔ نہیں ہوتی۔ چنانچہ اُن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان کا ایک لطیفہ تو ترقی کر کے اپنے کمال کو جا پہنچتا ہے، ورنہ حالانکہ ان کا دوسرا لطیفہ اپنے ہی کمال میں ہی پر رہتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص میں ایک لطیفہ اپنے درجہ کمال میں ہے۔ اور اس کے ساتھ اس شخص میں اس لطیفے کے باطل خلاف بعض مذموم چیزیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص میں تعوی و عصمت تو موجود ہے۔ لیکن اس کی عقل میں کوئی عیب ہے۔ یا ایک آدمی ہے جسے خدا تعالیٰ سے محبت تو ہے، لیکن شہوانی ہل اور اُن کے مشغلات سے وہ باز نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ شمار یہ غریب کے مشغلات جو نہ بہت مروجی ہے۔ اس میں اسکی نفسی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاربِ غمر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔
 ”الانری انہ یحب اللہ ورسولہ“ یعنی اُس کے دل میں تو خدا اور رسول
 کی محبت موجود ہے۔ لیکن اس کا نفس طبیعت کی کمزوری یا مزاج کی نادرستی
 کی وجہ سے افعالِ بد سے باز نہیں رہ سکتا ۔

صحابِ یمن کے اسی طبقے میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن
 میں ایک ہی لطیفے کی ایک وقت مناسب اور نامناسب دونوں صفتیں
 جمع ہو جاتی ہیں۔ یا اس کو یوں کہہ لیجئے کہ اُن کی عقل ایک چیز میں تو مؤثر
 ہوتی ہے۔ لیکن دوسری چیز پر اس کا مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً ایک
 شخص مومن ہے اور وہ ایمان کی تصدیق کرنے والا اور توبہ گزار بھی ہے لیکن
 ڈاڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹوانے میں اس ایمان کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔
 اب اس کا سبب ایک توبہ ہو سکتا ہے کہ وہ شروع ہی سے ڈاڑھی کٹوانے
 اور مونچھیں بڑھانے کا عزم کرے۔ اور اس فعل کے متعلق اس تک ایسی دلیل نہیں
 پہنچی جو اسے اس کے ارتکاب سے باز رکھ سکے یا یہ ہوا ہو کہ اس کے دل
 میں اسی دلیل کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے
 کہ اس کے نزدیک خدا کا کوئی مقبول بندہ ایسا گزر چکا ہو جو اس کے
 خیال میں ڈاڑھی کٹوانا اور مونچھیں بڑھانا تھا اور اس نے اس سے یہ نمونہ لیا ہو
 کہ یہ فعل اتنا بُرا نہیں، الغرض اس سلسلہ میں یہ چند مثالیں درج کی جاتی
 ہیں، انہی پر آپ دوسرے معاملات کو قیاس کر سکتے ہیں
 قصہ مختصر، اصحابِ یمن کی بہت سی قسمیں ہیں اور یہ تمام کے تمام لوگ

نفس کی کچی اور طبیعت کی ناہوشی سے سامانی جو چمکے ہوتے ہیں اور ان میں ایک حد تک نجات پانے کی استعداد بھی موجود ہوتی ہے۔ ان اصحاب میں سے ہر گروہ اپنی خاص نسبت رکھتا ہے اور ان میں ہر نسبت کی ایک تصویر وہ ہوتی ہے جسے کل ترین صورت کہنا چاہیے۔ اور اسی کی ایک دوسری ادنیٰ صورت بھی ہوتی ہے۔

اہل اشرار میں سے جو بزرگ کسی نسبت کا مل کے اکٹھے ہوتے ہیں، ان کو اس نسبت کا قطب کہا جاتا ہے۔ اب اگر ہم یہاں ان قطبوں کے احوال و آثار بیان کرنے لگیں۔ تو یہ ایک بڑی طویل بحث ہوگی۔ اس لئے فی الحال ہم اس طرف نہیں آتے۔ اہل اشرار کی ان نسبتوں کو بعض عادت قرآن مجید کی آیات کے ناموں پر مبنی کرتے ہیں۔ مثلاً جو آیت کسی نسبت پر دلالت کرتی ہے۔ یہ عادت اس نسبت کو اس آیت کی طرف کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور پھر اس نسبت کے قطب کو اس آیت سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ شیخ اکبر محمد الدین بن عربی نے اپنی کتاب فتوحات میں یہی چیز بیان اختیار کی ہے لیکن یہ تسامح کی زبان ہے یعنی انہوں نے فرضی ہولت ان امور کو بیان کرنے کے لئے یہ طریقہ پسند فرمایا ہے اور کبھی کبھی ان نسبتوں میں سے ہر نسبت کو اس بنی سے بھی مبنی کر دیا جاتا ہے جسکی خاص نام اس نسبت کے حکام و آثار زیادہ ظاہر ہوئے چنانچہ اس نسبت کے قطب کو اس بنی کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ طرز بیان بھی از قبیل تسامح ہے۔ بہر حال ”دفعی و جہتی“ ہو مولا۔ ہر شخص کی اپنی اپنی پسند اور ہر ایک کا کوئی ٹکڑی رٹنے جاتا ہے۔

کرامات و خوارق

فیض کو تباہ کیا ہے کہ کرات اور خوارق جن کو کہ عام طور پر خلاف عادت امور سمجھا جاتا ہے، خود اپنی جگہ اور اپنی حدود میں باطل مطابق عادت ہوتے ہیں۔ ان کرات اور خوارق کے مطابق عادت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ انسانی کافس ناطقہ اپنی فطری خصوصیات کی وجہ سے ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد جب منازل سلوک طے کر کے اس منزل پر پڑتا ہے، جہاں کہ امور غیبی اس کے سامنے شکست ہو جاتے ہیں، تو اس حالت میں جو بھی وہ دعا کرتا ہے قبول ہوتی ہے۔ اس عالم انفس میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ دستور کی پابندی نہایت ہوتی ہے۔ جس طرح ہم عالم آفاق میں اس کو برسر کار دیکھتے ہیں، مثال کے طور پر ایک شخص ہے جو زبان کھاتا اور اس ترقی کا اثر لگا، اور اس سے زہر کا اثر زائل ہو جائے گا، یا ایک شخص جو کشت اور کھانا ہے، یہی طور ہے کہ شخص مضبوط ہوگا، علیٰ ہذا القیاس

اسی طرح کائنات کے دوسرے معاملات میں بھی افسر کا قانون جاری و ساری ہے۔
 اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ کرامات اور خوارق مطابق عادت ہی ہوتے ہیں تو
 بھران کو کس بنا پر خوارق اور خلاف عادت کہا جاتا ہے؟ ان امور کو خوارق
 عادت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم عام طور پر چیزوں کو اپنے سامنے آئے دن جب
 طرح ہوتے دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ کرامات اور خوارق ہمارے اُن مشاہدات سے
 جن کے ہم عادی ہو چکے ہوتے ہیں مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس بنا پر انھیں
 خوارق کہا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ جو خوارق عادت واقعات رونما ہوئے
 ہیں، ان میں سے ہر نوع کے سوائے ایک نہ ایک ریاضت مقربہ ہے۔ چنانچہ جب
 کوئی شخص یہ ریاضت کرتا ہے تو اس ریاضت کی نوع کے خرق عادت واقعات
 اس سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ خوارق کی جو ریاضتیں ہیں، ان کا ایک حصہ تو
 وجدان کے ذریعہ معلوم ہو سکتا ہے! اور ایک حصہ حقائق فراست کی مدد سے
 بیان ہو سکتا ہے۔ اور نیز اصحاب کرامات کی صحبت میں بیٹھنے، اور اُن سے جو
 ظاہر ہوتے ہیں، ان کے آثار و قرائن میں غور و غوص کرنے سے بھی ان واقعات
 کا بہت کچھ علم حاصل ہو سکتا ہے۔

ان خوارق میں سے ایک چیز مستقبل کے واقعات کا ہانا ہی انسان مستقبل
 کے واقعات کو کئی طرح کو جان سکتا ہے۔ کسی تو وہ ہونے والے واقعات کو
 خواب میں اپنی آنکھوں کے سامنے، مشکل دیکھ لیتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی تعبیر
 یا تاویل کر کے اصل حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ

آدھی جاگ رہا ہے۔ اور کیا رنگی کوئی واقعہ اس کے سامنے صورت پذیر ہو جائے اور پھر فوراً ہی یہ صورت سامنے سے غائب بھی ہو جاتی ہے۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ وہ نیند اور بیداری کے درمیانی لمحات میں آنے والے واقعہ کی شکل دیکھتا ہو۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی قوت متوجہ ہونے والے حادثے کی ایک تصویر بناتی ہے۔ اس وہی تصویر کی نہ کوئی بنیاد شکل ہوتی ہے، اور نہ کوئی مخصوص رنگ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے کہ کوئی شخص اپنے ذہن میں قوت متوجہ کی مدد سے محبت یا نفرت کی ایک تصویر بنائے۔ علاوہ ان کے مستقبل کے واقعات کے جاننے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ آدمی باہر سے واقف کی آواز سنتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس کے آہستہ آہستہ واقعات کی خبر ہو جاتی ہے۔

الغرض یہ اور اس قبیل کے دوسرے واقعات کے رونما ہونے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں جو حادثہ رونما ہو نہیلا ہوتا ہے، وہ پہلے ملامتوں میں منظر ہوتا ہے۔ اور وہاں سے کبھی کبھی ملامتوں کے فرشتے اس ہر نیر والے واقعہ کا علم حاصل کر لیتے ہیں۔ اب ایک شخص ہے جس کا غرض نفاق کسی نہ کسی طریق سے اس عالم اور اس عالم کے یہی تقاضوں سے بلند ہو کر ایک موقع پر ملامتوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک تینہ کا رخ پہلے زمین کی طرف ہو یا در پھر اس کو پھر کر اس کا رخ آسمان کی طرف کر دیا جائے جب کوئی شخص اس طرح ملامتوں کی طرف متوجہ ہو گیا تو اس کے غرض نفاق پر ہونے والے حادثے کا انکشاف ہوتا ہے۔ لیکن اس انکشاف کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں۔ ایک یہ کہ اس خاص حادثے کے ساتھ اس شخص کی طبیعت کو اور حوادث کو زیادہ ملنا

ہو۔ بات یہ ہے کہ جب تک طبیعت کو اس خاص حادثے سے مناسبت نہ ہوگی۔ ممکن نہیں کہ اس کا علم اس شخص کو حاصل ہو سکے۔ کیونکہ قدرت کے کارخانے میں کسی چیز کو کسی سبب اور وجہ کے بغیر دوسری چیز پر ترجیح نہیں دی جاتی۔ کسی خاص حادثے سے ایک شخص کی طبیعت مناسبت کے بھی نہیں اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس شخص کی طبیعت کو خود اس حادثے کا علم حاصل کرنے کا اشتیاق ہو۔ اب یہ اشتیاق خواہ مخفی ہو یا ظاہر اور بڑا طور پر جیسے قدرتی طور پر ایک فائدہ مند شخص، سودگی و کٹائش کا مشاق ہو رہا ہے۔ گو اس کے ذہن میں اس اشتیاق کی صورت بالفعل موجود نہ بھی ہو۔ دوسرے ایک شخص میں کسی حادثے سے طبیعت مناسبت فرشتوں کی طرف سے بھی پیدا کی جاتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کسی کو مصیبت سے نجات دینا چاہتا ہے، یا اس قبیل کی کوئی اور بات ہے، جس کا تدبیر الہی تعاضد کر رہی ہے۔ اب یوں ہوتا ہے کہ فرشتے خواہ مخواہ ایک شخص کو یہ بات سمجھا دیتے ہیں۔ اور اس طرح اس شخص کی طبیعت کو اس سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ ہونے والے حادثے میں کوئی ایسی خصوصیت ہے جس سے اس شخص کی طبیعت میں فطری مناسبت موجود ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو اس دنیا میں جو عمومی اور کئی تدبیری کام کر رہی ہیں ان سے مناسبت ہو چنانچہ اس کو ان کا علم عطا ہوتا ہے۔ اور دوسرے کو جو وہی واقعات و حوادث سے فطری لگاؤ ہے۔ چنانچہ وہ ان کو جان لیتا ہے۔ اسی پر اب اس قسم کے واقعات کو قیاس کر سکتے ہیں۔ اور کبھی مستقبل کے کسی واقعے کے انکشاف

کی بصورت بھی ہوتی ہے کہ ہونے والے واقعہ کے متعلق مظہرۃ القدس میں حتیٰ فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے اور مظہرۃ القدس کے اس فیصلہ کا اثر تمام نفوس انسانی میں سرایت کر جاتا ہے، بعینہی طرح میں طرح اتفاق کے طلوع ہونے ہی اس کی شعاعیں ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔ اب ایک شخص ہے جو بصیرت کے تقاضوں کو آزاد ہو چکا ہے اور اس کی چشم بصیرت وہ ہے تو لا محالہ اس شخص پر مظہرۃ القدس کے اس فیصلے کا انکشاف ہو جائے گا۔ لیکن یہ صور میں زیادہ ترڑے بڑے واقعات میں پیش آتی ہیں اور اہل کشف کو ان بڑے واقعات ہی میں سے کسی نہ کسی واقعہ کا علم کشف کے ذریعہ ہوتا ہے۔

کسی خاص حادثے سے ایک شخص کی طبیعتی مناسبت کے کچھ اسباب قوت میں جن کا ادب پر بیان ہوا۔ اور اس شخص میں دوسری بات یہ ہے کہ کسی واقعہ کا خاص صورت اور کیفیت میں رونما ہونا کچھ مخفی اسباب کا بھی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہ مخفی اسباب اہل اسکی طرح کے ہوتے ہیں جس طرح کے اسباب کا ادب پر ذکر ہو چکا ہے۔ یعنی استقبال کے کسی واقعہ کا خاص صورت اور کیفیت میں منکشف ہونا یا تو اس شخص کی اپنی طبیعت کے تقاضا کا اثر ہوتا ہے۔ یا عالم کی طرف سے اس شخص کے دل میں اس واقعے کے ساتھ مناسبت پیدا کر دی جاتی ہے۔ یا خواہ اس واقعہ کا یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ اس شخص پر فطری طور پر منکشف ہو جائے۔ علاوہ ان میں کسی خاص موقعہ پر ایک شخص کا طبیعت کے یہی اثرات سے آزاد ہونا بھی ان مخفی اسباب میں داخل ہے۔

اس قسم کے خوارق کے اکتساب کا طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص جب نسبت

بے ثنائی سے ایک حد تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بہترین حالت میں بھی پاتا ہے۔ یعنی نہ وہ جھوکا ہوتا ہے نہ عدسے زیادہ میر نہ وہ ٹسکروں سے ہوتا ہے۔ اور نہ اسے ادھر اُدھر کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور وہ پاک و صاف ہوتا ہے۔ اور نگاہوں کا رنگ اس کی لطیفیت پر چڑھا نہیں جاتا۔

الغرض یہ شخص اس حالت میں جب غیۃ القدس یا لاکر نظام کی طرف اپنی پوری محنت سے توجہ کرتا ہے۔ اور اس دوران میں اس کے دل میں کبھی کبھی ہونے والے واقعہ کو معلوم کرنے کا خیال بھی گزرتا ہے تو دیر یا سیر میں شخص پر یہ واقعہ نمودار ہو جاتا ہے۔

خوارق کے اسباب میں سے ایک سبب شخص اکبر میں ایک ہی قوت واحد کا ہادی دساری ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہادی نزدیک بہ ایک سلسلہ حقیقت ہے کہ عالم علوی اور سفلی دونوں کر مثل ایک شخص کے ہیں۔ اس شخص اکبر کے نفس کو ہم نفسی کہتے ہیں۔ اور اس کے بعد جسم کو جو کہ عبارت ہے عرش اور بانی سے۔ جسود کل کا نام دیا گیا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ اس جسود کل کے نام احوال و اعراض میں صرف ایک تدبیر کام کر رہی ہے۔ جیسے اسی طرح جس طرح کہ نباتات و حیوان میں نشوونما اور غذا کا ایک نظام ہے۔ چنانچہ نباتات و حیوان کے کسی فرد میں جب اس کا ایک عضو حرکت کرتا ہے تو ضروری ہوتا ہے کہ اس سے اس کا دوسرا عضو بھی حرکت کرے۔

اب جب آخری نمودار ہوا۔ اور تدبیر الہی کے سلسلہ کی طرح پڑی تو اس تدبیر الہی کے بڑے بڑے امور و بصفتِ خواہ مخواہ اگلے اور ملے راسخ میں

جوش زن ہوئے تو اس سے جمادات، نباتات، حیوانات اور عناصر پر بھی فزع انسان میں جو تدریجیں برسر کار ہیں، ان میں ایک طرح کی وحدت پیدا ہوگئی۔ اس ضمن میں ہوتا ہے کہ ایک قوت تو اس عالم اسفل سے اوپر کی طرف کو جاتی ہے اور حقیقۃ القدس سے جا کر مل جاتی ہے اور وہاں ایک طرح کا تصرف کرتی ہے اور ایک قوت حقیقۃ القدس سے نیچے اس عالم اسفل میں نزول کرتی ہے۔ اور اس عالم میں اور عناصر طور پر ہوا و آسانی میں موثر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے تمام نفوس اس کے اشارے پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں نہیں کہیں یہ گمان نہ گزرے کہ میں مقام کوہم حقیقۃ القدس پر رہے ہیں، شاید وہ نبی آدم سے کئی مسافت دور ہوگا، یا وہ اس دنیا سے کہیں کسی بندی پر یا کسی اور طرف واقع ہوگا، بات یہ نہیں ہے بلکہ دراصل حقیقت یہ ہے کہ حقیقۃ القدس اور نبی آدم میں اگر فرق و تفاوت ہے تو صرف مرتبہ و مکانیت کا ہے، بعد و مسافت کا نہیں اور حقیقۃ القدس کی ہم سے وہی نسبت ہے جو روح کو ہم سے ہوتی ہے۔

جو جاں، اندر حق و حق جاں ندریدہ

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس زمین میں بسنے والے جب غلصات اور اس قسم کی لوہ تدبیروں سے کام لیتے ہیں یا کسی نہ کسی طرح وہ اپنی عبتوں کو حقیقۃ القدس تک پہنچا دیتے ہیں، مثلاً جب لوگ بارش گئے گئے نازا مستقامیں جمع ہوتے ہیں، یا حج میں مقام عرفات میں رحمت کی دعا مانگتے ہیں تو یعنی طور پر یہ چیزیں نظام عالم میں موثر ہوتی ہیں۔

اسی قبیل سے بہت اور قوجہ کا عالم کرنا بھی ہے اور اس کی تفصیل یوں ہو
 کہ ایک شخص جو شرابی و عزم ہے۔ اور اس کی جبلت میں تصرف کی قوت و عبت
 کی گئی۔ اس کے بعد اس نے محنت اور ریاضت کے ذریعہ اس قوت تصرف
 سے اور بھی مناسب پیدا کر لی ہے۔ اب یہ شخص ایک کام کی طرف متوجہ ہوتا
 ہے۔ اس ضمن میں جو عزم و ارادہ کرتا ہے، تو اس کا یہ عزم و ارادہ حظیرۃ
 القدس تک جاپہنچتا ہے اور وہاں کسی نہ کسی طرح اپنی تاثیر ڈالتا ہے چنانچہ
 حظیرۃ القدس کی یہ تاثیر اس شخص کی بہت اور نیز اس شخص کے پیش نظر کام کے
 جیسے اسباب و حالات ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق عالم اسفل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔
 اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عالم اسفل کی قوتیں حظیرۃ القدس میں کیسے
 تصرف کرتی ہیں؟ ان قوتوں کے اس تصرف کی مثال یوں سمجھئے جیسا کہ خیال
 ہمارے اندر تصرف کرتا ہے۔ یعنی پہلے تو خیال قوائے مدرک کے ذریعہ
 ہمارے اندر معرض وجود میں آتا ہے اور پھر اس سے ہمارے اندر عزم و ارادہ
 پیدا ہوتا ہے۔ اور اس طرح خیال میں متاثر کرتا ہے۔ یا عالم اسفل کی ان
 قوتوں کے تصرف کی مثال قوت منویہ کی سی ہے، کہ وہ ہمارے دل اور
 حواس کو منسی اعمال کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ اور ان سے ہمارے شہوانی
 بذات کی تسکین ہو جاتی ہے۔ حظیرۃ القدس میں عالم اسفل کے ان اثرات
 ہی کا نتیجہ ہے کہ ملائکہ جن اور وہ روحیں جو اپنے جسموں سے الگ ہو کر
 دوسرے عالم میں پہنچ چکی ہوتی ہیں مختلف شکلوں میں انسانوں کے لئے
 ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

اس اجال کی تفصیل یہ ہے کہ ٹانگہ جن اور یہ روحیں اس عالم میں ظہور پذیر ہونے کیلئے کوئی نہ کوئی شکل اختیار کر سکی محتاج ہوتی ہیں چنانچہ بڑی خوش اور بہت ہی اپنے آپ کو کسی نہ کسی شکل میں صورت پذیر تصور کرتی ہیں اور ان کا یہ تصور اس قوت کی قنات سے جو حقیقۃ القدس میں دولت کی گئی ہو۔ عالم مثال کے دروازوں کا ایک دروازہ کو کھول دیتا ہو اور انکی وجہ سے ان کے اس تصور میں بڑی برکت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعد ازاں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ٹانگہ جن اور یہ روحیں ایک خاص صورت میں رونما ہوتی ہیں اور اس صورت کی بہت اور کیفیت تمام لوگوں کی حس مشترک کو متاثر کر دیتی ہے۔ اور اس طرح یہ لوگ اس صورت کا ادراک کرنے لگتے ہیں۔

الغرض ٹانگہ جن اور ان روحوں کی صورتیں انسانوں کے اور کائنات میں اس طرح اپنا نقش جاتی ہیں جس طرح کہ ان کے دلوں میں فرشتوں کے الہامات ہدایت و ارشاد اور شیاطین کے دوسرے اور پریشان کن خیالات جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ اور انسانوں کی حس مشترک میں ٹانگہ جن اور ان روحوں کی شکل پذیری کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ہم ایک جلتی ہوئی چنگاری کوئے کر گھامیں تو ہمیں آگ کا ایک دائرہ نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان کو ٹانگہ جن اور ان روحوں کی صورتوں میں سے کسی صورت کا ادراک حد کمال میں صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کہ وہ گرد و پیش کے علائق اور اُن کے اثرات سے یکسر منقطع ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کے لئے ان صورتوں کے ادراک کی بھی ایک سی کیفیت نہیں ہوتی بلکہ ہر شخص

اپنی استعداد کے مطابق ہی ان صورتوں کو اپنے سامنے ظہور پزیر دیکھتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی مجلس میں بعض افراد ان صورتوں میں سے کسی صورت کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کو کچھ نظر نہیں آ رہا ہوتا۔ اور نیز بعض اس صورت کو ایک رنگ میں دیکھتے ہیں اور بعض کو دوسرے رنگ میں یہی صورت نظر آتی ہے۔

اس ضمن میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی صورتیں ہوا پانی، آگ، اور خاک کے یہ چار عناصر ہیں۔ ان میں سے عنصر اول میں نقش ہو جاتی ہیں۔ اس عنصر اول کی خاصیت یہ ہے کہ وہ چاروں عناصر میں مشترک ہوتا ہے اور نیز روحانیت میں اس کی تاثیر قوی تر ہوتی ہے۔ چنانچہ عنصر اول کی دوسرے عناصر کے ساتھ ہی نسبت ہوتی ہے، جو نسبت ان عناصر کی حادثات، نباتات اور حیوانات کے عالموں سے ہے۔ اور غلام، کاحمال ہونا اور شیخے کے برتن کا خاص حالت میں ٹوٹ جانا حقیقت میں عنصر اول ہی کی خصوصیت کا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً یمن یعنی اریطو کے پیردوں نے اسی عنصر اول کو ہولائے عذری کا نام دیا ہے۔

انفرض مانگہ، جن اور بان روجوں کی صورتیں جب اس عنصر میں منعکس ہوتی ہیں تو اس کے بعد یوں ہوتا ہے کہ نفوس مقدسہ میں سے ایک شخص جو سداے اول کے جوارح میں سے ایک جارجہ ہوتا ہے، یعنی قدیر الہی جن ذریعوں سے اس کائنات میں تصرف کرتی ہے، یہ شخص ان ذریعوں میں سے ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہ شخص پوری ہمت سے مانگہ، جن اور

ان روجوں میں سے کسی ایک کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ماورائے کی صورت کا تصور کرتا ہے۔ اس شخص کی اس بہت و توجہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مدبرِ مثال اور خلیفۃ القدس سے بے نہایت قوتیں اس موقع پر زلزلہ فرماتی ہیں۔ ماورائے کی وجہ سے ایک صورت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ لیکن یہ صورت فنا پھر کی تاثیر کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ اس صورت کی ایک مثال تودہ آگ ہے، جو طور میں حضرت موسیٰؑ نے مشاہدہ کی تھی۔ ماورائے کی دوسری مثال وہ واقعہ ہے جو صحیح مسلم میں حضرت جبریلؑ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کا عروہ ہے۔ جس میں کہ آنحضرت سے حضرت جبریلؑ نے اسلام، ایمان اور احسان کے متعلق سوالات کئے تھے، اس طرح کا واقعہ تو خاذاً و نادراً ہی کہیں ہوتا ہے۔ البتہ حضرت موسیٰؑ نے طور پر جہانگ دیجی تھی، اس قسم کے واقعات کثرت سے معروض وجود میں آتے رہتے ہیں۔

خوارق و کرامات کے سلسلہ میں یہ اساسی امور اور مقدمات ہیں جن کا کہ اوپر بیان ہوا۔ چنانچہ اس ضمن میں صوفیاء سے اس قسم کے واقعات جو رونما ہوتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے عالم تدبیر و خلق میں کوئی تصرف کر دیا یا اپنی توجہ سے کسی گنہگار کو توبہ کی طرف مائل کر دیا یا انہوں نے کسی کا دل سخر کر دیا یا کسی شخص کے ذہن میں کسی پہننے والے واقعہ کا علم افکار دیا، یا اوہ کی نسبتوں میں سے کوئی نسبت کسی شخص کے دل میں پیدا کر دی، یا بیمار کی بیماری دور کر دی، یا اس طرح کی کوئی اور چیز ان کی بدولت ظہور میں آگئی، ان معروض صوفیاء کے اس قسم کے واقعات خوارق کے ان اساسی امور اور مقدمات

ہی کی شاخیں اور فروغ ہوتے ہیں۔

خوارق اور کرامات کے اسباب میں سے ایک سبب برکت کا فیضان بھی ہے۔ اور برکت کی حقیقت یہ ہے کہ ملا راعی اور ملا رساغل ایک شخص پر اپنی رحمت کی نظریں ڈالتے ہیں اور اس شخص کے حق میں دعائیں کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نظر رحمت اور دعائوں کا اثر ہوتا ہے کہ ملا راعی اور ملا رساغل میں سے ایک قوت اس شخص سے باکس متصل ہو جاتی ہے۔ اور اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اور اس شخص کے وجود میں مکمل مل جاتی ہے۔ ملا راعی اور ملا رساغل کے اس فیضان کی وجہ سے اس شخص کے لئے طبعی اسباب میں تسطہ ہوتا ہے۔ یعنی ان اسباب میں اس کے لئے خلاف معمول قوت و استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس حالت میں اس شخص سے ایسے ایسے نفع مندرام اور آثارِ غیر ظاہر ہوتے ہیں کہ جن کی کہیں نظیر نہیں مل سکتی۔

ملا راعی اور ملا رساغل سے اس فیضانِ برکت کی مثال یہ ہے کہ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ جب وہ کسی مرض کے دفع کرنے میں مشغول ہو یا وہ غلامت اور خوف میں مبتلا ہو یا اسے کسی بات پر غیرت آگئی ہو تو اس حالت میں اسے بھوک کا باطل چرکا نہیں رہتا۔ اور جب تک اس کی یہ حالت رہتی ہے، اس کے اجڑے بدن کی تحلیل کا فعل بھی ٹرک جاتا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھوک کا یہ عدم حساس اور اجڑے بدن کا تحلیل نہ ہوتا، ایک خاص مدد تک ہوتا ہے۔ جب صحت یہ ہے کہ جب ملا راعی اور ملا رساغل سے اس شخص پر برکت کا فیضان ہوتا

ہے اور اس شخص میں اور اس برکت میں پوری ہم آہنگی ہو جاتی ہے تو اس کا
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص میں بھوک کے عدم احساس کی استعداد اور جڑائے
بدن کی تحلیل نہ ہونے کی قوت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ
اس حالت میں وہ ایک عرصہ تک بغیر کھانے زندہ رہ سکتا ہے۔ اور اس سے
اس کے جسم کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔

بعض دفعہ طارقات اور طارقات کی برکتوں کے نزول کے لئے ہمارے
اہل میں سے محدود قس اور ستوح کا ذکر ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور کبھی کسی
بزرگ کی توجہ بھی ایک شخص کو ان برکتوں کا حامل بنادیتی ہے۔ اس اجمال کی
تفصیل یہ ہے کہ انسان جب حالت انبساط میں ہوتا ہے تو اس کی طبیعت میں
قدرتی طور پر یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ کام کر سکتا اور
زیادہ عرصہ تک بیدار رہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس حالت انبساط میں زیادہ
کام کرنے اور زیادہ دیر تک جاگنے کی وجہ سے اس کی صحت پر کوئی بُرا اثر
نہیں پڑتا۔ لیکن اس کی بھی ایک مدد ہوتی ہے۔ یہی شخص جب انقباض کی
حالت میں ہوتا ہے تو اس میں پہلے کے مقابلے میں نصف اور تہائی قوت
عمل بھی نہیں رہتی۔ چنانچہ اگر وہ اس حالت میں اپنی طبیعت پر زبردستی کر کے
زیادہ کام کرتا اور زیادہ عرصہ تک جاگتا ہے تو اس سے اس کی صحت پر بُرا اثر پڑتا
ہے۔ انقباض ایک شخص پر جب ملے برکتوں کا فیضان ہوتا ہے اور اس شخص میں اور ان برکتوں
میں کی مطابقت اور پوری ہم آہنگی ہو جاتی ہے تو حالت انبساط میں بھی زیادہ اس شخص
میں زیادہ کام کر لے اور زیادہ عرصہ تک جاگتے رہنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں فطرت انسانی کا یہ ایک سترہ اصول ہے کہ انسانوں میں سے جوڑکی ہوتے ہیں، ان کا فہم یا توازن دلال عقلی کے ذریعہ ایک چیز سے دوسری چیز کا ادراک کر لیتا ہے، یا وہ جو کہ ایک چیز کے بعد لازماً دوسری چیز کو ہونے دیکھتے آتے ہیں، اس لئے وہ عادتاً ایک چیز سے دوسری چیز کو سمجھ جیتے ہیں، اور یا وہ ایک شخص کی ظاہری شکل و صورت سے اُس کے باطنی اخلاق کا پتہ لگاتے ہیں، یا جو کچھ کسی شخص کے دل میں خیالات و خطرات تھے ہیں، وہ اُن کا اندازہ اس شخص کے چہرے کی خاص بنیت اور اس کی آنکھوں کی کیفیت، اور اس طرح کے دوسرے آثار و قرائن سے جان لیتے ہیں۔ لیکن ایک شخص خواہ وہ کتنا بھی ذکی کیوں نہ ہو وہ ان چیزوں کو اس طرح کے آثار و قرائن سے صرف ایک حد تک ہی معلوم کر سکتا ہے، اب ہوتا یہ ہے کہ اُس کی شخص پر جب طار مٹنے اور طار مٹنے کی برکتوں کا نزول ہوتا ہے، اور یہ برکات اُس کے نفس کا احاطہ کرتی ہیں تو اُن کی وجہ سے اس شخص کی ذکاوت بہت بڑھ جاتی ہے، چنانچہ اس حالت میں اس سے فراست و انفعال ذہن کے عجیب عجیب واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، اور اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اُس شخص میں "اشراف" اور "کشف" کی بعض استعدادیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ان کے ذریعہ دوسروں کے دلی اسرار معلوم کر سکتا ہے۔

خوارق و کرامات کے ضمن میں فیضانِ برکات کی ایک اور شکل بھی ہوتی ہے۔ اور اُس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں، اُن میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی اعتقاد منور رکھتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اس اعتقاد کی ہر شخص کے

اندر ایک صورت مضمر ہوتی ہے۔ جب کسی شخص اپنے اس اعتقاد کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو یہ تو بہ اس کے اعتقاد کو مشکل طور پر اس کے سامنے لا مانس کرتی ہو اور کسی ایسا جی ہوتا ہے کہ اعتقاد کی یہ شکل اس شخص کی قوت تنقید کی طرف خود اثر ممتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کی قوت تنقید اعتقاد کی اس شکل کو طرح طرح کے اوضاع و احوال اور رنگوں کا لباس پہنا دیتا ہے چنانچہ جب کسی شخص نے اپنے اعتقاد کو اس طرح مشکل دیکھنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے تو اسی حالت میں اس شخص پر ظاہر اعلیٰ اور ظاہر اسفل کی برکتوں کا نزول ہوتا ہے اور ان کی وجہ سے وہ عیب غیب تعلیلات دیکھتا ہے اور خواب میں اُسے روئے سنا کر نظر آتے ہیں۔

خوارق و کرامات کے شخص میں جو کچھ ہم بیان کر سکتے ہیں، اس نزول میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ تصوف کے ہر طریقے میں بعد میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے گرمی بازار کے سنے اور خود اپنی کرامات اور خوارق کے اظہار کی خاطر بہت دتوبہ کی تاثیر و صوت اہمار اور اسی طرح کی عیب غیب چیزیں اپنی طرف منسوب کر لی ہیں اور اس کے علاوہ بعض لوگوں نے تو جو زبردستی صحیح طریقت بن بیٹھے ہیں۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ طلسمات، نیز نجات اور رمل و جفر وغیرہ کا بھی اپنی طرف اضافہ کر لیا ہے۔ بہر حال یہ جان لینا چاہیے کہ یہ اور اس طرح کی اور چیزیں ہمارے اس موضوع سے جو خوارق و کرامات کے متعلق ہے، باطل خارج ہیں۔

نخت کا بیان

فخیر کو بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جو حادثہ رونما ہوتے ہیں، ان کے منجملہ اور اسباب میں سے ایک سبب نخت بھی ہے۔ اور بعض لوگ جو نخت کا سرے سے انکار کرتے ہیں وہ دراصل نخت کی حقیقت نہیں جانتے ہوتے۔

اور نیز مجھے بتایا گیا ہے کہ بعض وفداہل عرفان اور اصحاب ارشاد سے جو عجیب غیب آثار و کرامات صادر ہوتے ہیں ان کا حقیقی سبب دراصل یہی نخت ہی ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ ظاہر نہیں ہوتے ہیں، وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے، اور وہ ان آثار کو اہل عرفان اور اصحاب ارشاد کی کرامات قرار دے لیتے ہیں۔ بے شک اس سلسلہ میں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اہل عرفان اور اصحاب ارشاد کے یہ آثار عجیب ہوتے ہیں نخت کا، اور اس کے ساتھ ان

بزرگوں کی خصوصی نسبت بھی مخلوط ہوتی ہے۔ چنانچہ اس حالت میں ابن آثار کو ان اہل عرفان اور اصحاب ارشاد کے خوارق احوال کرات کہنا ایک حد تک جائز ہو سکتا ہے۔

اس نسلے میں مجھے اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعاطیس کی اس فطرت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ لوہے کے اجزا کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اور اسی طرح کہسہ باگھاس کو اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ اور ان کی یہ فطرت ہے کہ وہ ثقیب کی طرف ہجرت ہے۔ یہ سب خاصیتیں ان چیزوں کے فطری تقاضے ہیں کہ ان میں کوئی شکل واقع نہیں ہوتا۔ ان اس ضمن میں بعض خارجی اسباب ایسے پیش آجاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے ان چیزوں کے یہ فطری تقاضے مختلف اثرات قبول کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر متعاطیس کو بجھے۔ اس میں توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کی فطری قوت تو موجود ہے لیکن فرض کیا جس لوہے کو وہ کھینچ رہا ہے، اس کا وزن بہت زیادہ ہے۔ اور مجرد متعاطیس سے دور بھی پڑا ہوا ہے۔ ظاہر ہے لوہے کے وزن اور متعاطیس سے اس کے دور ہونے کا اثر متعاطیس کی قوت جذب پر لازمی طور پر پڑے گا۔ یا مثلاً پانی کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ثقیب کی طرف ہجرت ہے، لیکن فرض کیا پانی کے بہاؤ کے خلاف جہاز چل رہی ہے۔ یا کوئی اور سبب ہے جو پانی کی روانی کو روک رہا ہے۔ یعنی بات ہے کہ اسی کا اثر پانی کی اس فطری استعداد پر پڑے گا۔

الغرض جب بھی اس طرح کی کوئی صورت پیش آجائے تو اس کو کھینچنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک تو نظر اس چیز کی اصل فطرت کی طرف ہو کہ وہ کیا تقاضا

کرتی ہے۔ اور پھر اُن خارجی اسباب کو دیکھنا چاہیے کہ وہ اس پیزی کی اصل فطرت کے اظہار میں کس حد تک مانع ہیں۔

یہ جو کچھ عالم آفاق کی چیزوں کی خصوصیات کے متعلق بیان ہوا، جیسے یہی کیفیت عالم نفس کی بھی ہے۔ چنانچہ جس طرح اشتہار نے لوہے، ٹھکان اور پانی میں فطری خصوصیات دکھی ہیں، اسی طرح انسانوں کے نفس ناطقہ میں بھی اُس نے ایک نقطہ ودیعت کیا ہے۔ اور اُس میں اس نے ایک قوت رکھی ہے۔ نفس ناطقہ کے اس نقطے اور اس کی قوت کا فطری تقاضہ یہ کہ وہ دوسرے دونوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ چنانچہ اس نقطے کی وجہ سے اکثر اوقات لوگوں کے دلوں میں جذباتِ الہام یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ وہ اس نقطے والے کے آرام اور اس کی آسائش کے لئے کوشش کریں۔ مثلاً اس کے لئے کسی کے دل میں رجم پیدا کر دیا جاتا ہے، یا اس شخص کو کسی خزانے کی خبر دے دی جاتی ہے یا ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص اپنے راتے پر بار بار ہوتا ہے اور اپنا کھانے سے ٹھوکر کھتی ہے، اور اس کا پاؤں کسی دھن شدہ مال پر پڑ جاتا ہے۔

اس ضمن میں بار بار بات بھی مشاہدہ میں آئی ہے کہ ایک سعادت مند شخص ہے۔ اور اس کے نفس ناطقہ میں یہ نقطہ ہے۔ جو چمکتے ہوئے سارے کی طرح درخشاں ہے۔ اور اس سے ہر جانب کو شعاعیں نکل رہی ہیں۔ اب اس نقطے کی ان شعاعوں کا اثر ایک موقع پر تو بعض آدمیوں پر ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے موقع پر یہی شعاعیں ان آدمیوں پر بے اثر رہتی ہیں اور تیران شعاعوں کا اثر بعض نفوس پر تو بڑی قوت اور شدت سے پڑتا ہے، اور بعض پر ان کا اثر محبت و

مذہب کی راہ سے جاتا ہے ۔

اور جس شخص کے نفسِ امارۃ کے نقطے کا اثر دوسروں پر خواہ قوت و شدت کے ذریعہ ہو یا محبت و جذبہ کی راہ سے ۔ ہر دو حالت میں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص پر یہ اثر پڑتا ہے اس کے دل میں یہ الہام ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ اثر ڈالنے والے شخص کا مستفاد اور محب بن جائے ۔ چنانچہ وہ ہر طرح سے کوشش کرتا ہے کہ اس شخص کی کوئی خدمت بجالائے ۔ اثر ڈالنے والے شخص کے مقابلے میں اس اثرینے والے کی حیثیت ایسی ہوتی ہے جیسے کہ ایک شعلہ حرارت پیدا کرنے کا واسطہ بنتی ہے ۔ اور بعض دفعہ نفسِ امارۃ کا یہ نقطہ اس کائنات میں جو غیبی تدابیر کام کر رہی ہیں ان پر بھی اپنا اثر ڈالتا ہے ۔ اور ان کی وجہ سے یہ غیبی تدابیر نقطے والے کی بہتری کے لئے کوشاں ہو جاتی ہیں ۔ لیکن اس طرح کے اور اکثر غیبی معاملات ہی کے ذیل میں صرف پتھر پر جوئے کی بات ہے ۔

اب ایک شخص ہے جو قوی لا اثر سعادت والا ہے اور وہ ادنیٰ کی مجلس میں سے ہے اور اس نے نسبت سیکھنا حاصل کر لی ہے ۔ یا وہ نسبت باوجود سے بہرہ یاب ہے ۔ یہ نفس جب کسی مجلس میں جاتا ہے تو مجلس کا ہر فرد جتنا کمال اس کا طریقہ و تابعدار ہو جاتا ہے ۔ اور جب یہ شخص کوئی بات کرتا ہے تو اس کی بات جو کچھ کے لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے ۔ اس کے مطابق ہوتی ہے ۔ دراصل یہ شخص اہل مجلس کے دلوں کے سردار کو کشف و شرف کے ذریعہ معلوم کر لیتا ہے ۔ اور وہ انہی سردار پر گفتگو کرتا ہے ۔ بہا اوقات

ایسا ہی ہوا ہے کہ ایک شخص ہلاکت کے گڑھے پر کھڑا ہے۔ لیکن حکمتِ تقدیر کا
تھکانہ یہ ہے کہ یہ شخص ہلاک نہ ہو۔ چنانچہ اس حالت میں اس شخص کے سامنے
قوی الاثر سعادت واسے بزرگ کی صورت آگئی اور وہ اس کی وجہ سے ہلاکت
ہونے سے بچ گیا۔ قدرتی طور پر یہ شخص اپنی نجات کو اس بزرگ کی اس صورت
کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

کئی اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے جس میں آنے والے واقعات،
کاظم حاصل کرنے کی الہامی استعداد پہلے سے موجود ہے۔ اب اس شخص کو خواب
میں اس قوی الاثر سعادت واسے بزرگ کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ
وہ آنے والے واقعات کے متعلق تمام خوش خبریاں اور وعیدیں اسی بزرگ
کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ حصولِ الہام کے
جو بھی ذرائع ہیں، اس شخص کو ان میں سے کسی نہ کسی ذریعہ تک پہلے سے دسترس
حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ مختلف اشکال و صورتوں کے توسط سے الہام حاصل
کرنے کی استعداد بھی رکھتا ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ یا تو اس قوی الاثر سعادت
واسے بزرگ کا نقطہِ نجات بہت زیادہ ورخشاں اور روشن ہوتا ہے یا لوگ
عام طور پر اس بزرگ کو پہلے سے جانتے ہوئے ہیں، اور انھیں اس بزرگ سے
عقیدت ہوتی ہے، یا اس قسم کی کرامات اس شخص کے متعلق بہت مشہور ہوتی
ہیں۔ یا اسکی بزرگ نام نامی عالمی سطح میں رائج ہو چکا ہوتا ہے۔ یا کوئی اور
دعوت ہوتی ہے، الغرض یہ اسباب ہیں، جن کی وجہ سے یہ شخص باوجود خود اپنے
اندرواقعاتِ آئندہ کو الہام کے ذریعہ معلوم کرنے کی استعداد رکھتے ہوئے کسی

بزرگ کی صورت کی وسالت سے ان واقعات کا علم حاصل کرتا ہے۔

اس ضمن میں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جب تک زمانہ نئی یہ دور جاری ہے آنے والے واقعات کے متعلق انداز و بشارت کا یہ سلسلہ برابر قائم رہے گا۔ اور اس ذیل میں خواہی و کرات بھی ظاہر ہوتی رہیں گی۔ لیکن ان معاملات میں اب تک یہ ہوتا آیا ہے کہ جب تک مجوسیوں کا دور رواں اعداد بشارت اور خواہی و کرات کو ستاروں کی طرف منسوب کر دیا جاتا تھا۔

لیکن حضرت ہریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد جب خلیفیت کا زمانہ آیا، تو ان چیزوں کو ارواح کا لڑکی طرف منسوب کئے جانے لگا۔ چنانچہ اس کے بعد عربی ملت میں ان حقائق کا عنوان مختلف بزرگوں کی رو میں منتہی ملی آتی ہیں یعنی ان روحوں کی طرف ان حقائق کے انکشاف کو منسوب کر دیا جاتا تھا۔

اگر یہ قوی الاثر رسالت والا شخص ادویا کئے نہ آئیں میں سے نہیں، بلکہ بادشاہ ہے یا امیر یا وزیر ہے تو اس کو امور سلطنت کے ضمن میں جو معرکے اور مملکتیں پیش آتے رہتے ہیں اس کے نفسِ ناطقہ کا یہ نقطہ بخت اند میں کار فرما ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے شکروں میں اس کے اہل و اقارب ہیں۔ اور اس کے مال و بہار میں منت نئی ترقیاں اور بے شمار برکات اس طور پر ظاہر ہوتی ہیں کہ لوگوں کو اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ دوسروں کے مقابلہ میں اس شخص کو کوئی خاص امتیاز حاصل ہے۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس قوی الاثر رسالت والے شخص کا نقطہ بخت آثار و شہن نہیں ہوتا کہ بغیر کسی اور واسطے اور کسی اور کی تائید کے اس کی ذات

سے یہ تاثرات صادر ہو سکیں۔ چنانچہ یہ شخص بعض اُن اسمائے الہیہ سے وابستہ ہو جاتا ہے، جو بلند مرتبہ برکت والے حروف سے مرکب ہیں۔ چنانچہ ان اسمائے الہیہ کی عالم مثال میں جو صورتیں ہیں، یہ مثالی صورتیں کسی نہ کسی لحاظ سے اس شخص کے لئے نقطہ نجات کا کام کرنے لگتی ہیں۔ یا ایسا ہوتا ہے کہ یہ شخص ریاضتیں کرتا ہے اور توجہات میں مشغول ہوتا ہے۔ یا طہارت اور تعویذات سے مدد لیتا ہے۔ اور اس طرح اس کے نقطہ نجات کو غفلت کے بدردہ نشی اور غبار و کدورت کے بددہلا نصیب ہوتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ موت کے بعد اس شخص پر نقطہ نجات کے حقائق میں سے ایک حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ اور کبھی جمادات میں سے کوئی چیز لوگوں میں اس شخص کی رفعت شان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ وہ تبرکات جو بعض لوگوں کو خواب میں عطا کئے جاتے ہیں، وہ بھی ایسی قبیل میں سے ہیں۔

الغرض یہ اور اس طرح کے اور بھی بہت سی آثار ہیں، جو نجات کے اس نقطہ نورانی سے صادر ہوتے ہیں۔ اور لوگ اُن کو خوارق و کرامات سمجھتے ہیں۔ اور ان کو اس شخص کے کمالات میں سے شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں یہ سب شخص اس کے نقطہ نجات کے نتائج ہوتے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ ہونا ہے کہ نجات کے ساتھ اس شخص کی نسبت بھی ملی ہوئی ہوتی ہے

بعد ازاں میں نے اس امر میں غور و خوض کیا کہ آخر یہ نقطہ نجات ہے کیا چیز؟ اس ضمن میں مجھے بتایا گیا ہے کہ جہاں تک اس نقطے کی اصل کا تعلق ہے، اس کا قریبی سبب نورِ قوائے کلی کا اثر ہے۔ اور ان میں بھی خاص طور

پر اس قوت کا جس کا منہ سورج ہے۔ اور نقطہ نحت کا دور کا سبب وہ
تاثری نقطہ ہے جو مرکز جبروت میں واقع ہے۔ اب اگر میں ان امور
کی شرح کرنے لگوں تو یہ بڑی طویل طویل بحث ہو جائے گی۔

نقطہ نحت اور میں شخص میں کہ یہ نقطہ نحت روشن ہو، اس کا حال
تو ہم نے بیان کر دیا۔ اسی صاحب نحت سے اس شخص کا بھی اندازہ کیا جاتا
ہے، جس میں کہ یہ نحت مضمود ہے۔

معاذ اللہ کریم جو حکیم مطلق ہے۔ اس کے ان نہ تو کسی کی بے جا رہایت
ہوتی ہے، اور نہ بلا وجہ کسی پر زیادتی روا رکھی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک شخص
اگر صاحب نحت ہے، اور اس کا ظہر وہ محبوب و پسندیدہ ہے تو ہر ایک
ہے کہ اسے یہ الہام کیا جائے کہ وہ دنیا سے اعراض کرے اور لوگوں کی
صحبت سے منفر ہو۔ اور اس سے خوارق و کرامات ظاہر ہوں۔ اور گوشہ
نقشبندی سے اسے رغبت ہو۔ اس کے بعد جب یہ نفس خود اپنے آپ کی طرف
متوجہ ہوتا ہے تو وہ اپنے نفس الہامی کہ وہ ایک لطیف نورانی ہے۔ غلام
محسوس کرتا ہے، اور اس غلامی وجہ سے اس کے سامنے ایسا سی رہا کھل
جاتی ہے، جو اسے ان علوم و معارف کی طرف لے جاتی ہے۔ جو شہادت
اور تعیلات سے اور ایسی اور سنہری حیثیت رکھتے ہیں۔ اور بعض دنیا
یاب بھی ہوتا ہے کہ نفس مطلقہ کے اس غلامی طفیل باری تعالیٰ کے سامنے
وہیچے جھوڑ کر یہ شخص ہل ذات کو اپنا تصور بنالیتا ہے۔

اس شخص میں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ علمات اور تعویذات

وغیرہ جن پر کہ غیبا نبیاء کا عمل ہوتا ہے اور وہ دعائیں اور اسمائے الہیہ جن کی کہ تلقین انبیاء کرتے ہیں۔ ان دونوں چیزوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ غیر انبیاء کے طلسمات اور تعویذات کا سب سے پہلا مقصد ان قوتوں کو متاثر کرنا ہوتا ہے، جو اس عالم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور انبیاء کی تلقین کردہ دعاؤں اور ان کے بتائے ہوئے اسمائے الہیہ سے مقصود دعاؤں کی توجہ حاصل اور نیز جو شخص کہ نبیاء کی بتائی ہوئی ان دعاؤں اور اسمائے الہیہ کا ذکر کرتا ہے، اس پر خطیرۃ القدس کی رحمت کا نزول ہے۔ تاکہ دعا اعلیٰ کی بہ توجہ اور خطیرۃ القدس کی بہ رحمت اس شخص کے لئے کارساز و مددگار ہو۔ باقی اللہ تعالیٰ ان امور کو بہتر جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ "ہمات ختم ہو گئی" اور اس کتاب کی ابتداء میں ہم نے جو شرط کی تھی کہ ان وجدانی علوم کے ساتھ منقولات اور منقولات کو خلط غلط نہیں ہونے دیا جائے گا۔ وہ شرط پوری ہوئی۔ تمہات

۱۴۴۳ھ جمادی الآخر میں اتمام کو پہنچی :-

وآخر دعوانہ ان الحمد للہ رب العالمین

کتابخانه خواجه نصیرالدین طوسی
مکتبہ خواجه نصیر الدین طوسی
کتابخانه خواجه نصیر الدین طوسی
کتابخانه خواجه نصیر الدین طوسی

